مولائے کائنات

پھر حضرت علیؑ آئے

ڈی ایف کراکا

ترجمہ:
بشیر حسینؑ ملک

جواہر بک ایجنسی
مرکز مذہبی کتب و اسٹیشنری
اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز
عقب عزاخانہ زہرا(س)، نزد امام خمینیؒ لائبریری سولجر بازار کراچی۔
☎ 7225182

کلاسیک
لاہور

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان





۷۸۶

۹۲_۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنی

DvD Version

لبیک یا حسین

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

NOT FOR COMMERCIAL

www.ziaraat.com

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

مولائے کائنات

پھر حضرت علیؑ آئے

ڈی ایف کراکا

ترجمہ: بشیر حسین ملک

جواہر بک ایجنسی
مرکز مذہبی کتب و اسٹیشنری
بساطیٹ و جنرل آرڈر سپلائرز
عقب عزاخانہ زہرا(س)، نزد امام خمینی لائبریری سولجر بازار کراچی
☎ 7225182

کلاسیک لاہور

"اپنا وقت دُوسروں کی تحریروں کے مطالعے سے اپنی لیاقت بڑھانے میں صَرف کرو۔ اس طرح تُم اُن چیزوں کو نہایت آسانی سے حاصل کر سکو گے، جن کو حاصل کرنے میں دُوسروں کو محنتِ شاقہ برداشت کرنا پڑی۔"

سُقراط

ناشر:

آغا امیر حسین

کلاسیک (چوک ریگل) دی مال۔ لاہور

فون: ۷۳۱۲۹۷۷-۷۳۲۳۹۶۳

طابع: نفیس پرنٹرز۔ لاہور

بارِ اوّل: اکتوبر ۱۹۹۵

قیمت: ۶۰ رُوپے

پھر حضرت علی آئے

ترتیب

پھر حضرت علیؑ آئے

(حضرت علیؑ نے کس طرح کراکا کی کایا پلٹ دی)



تعارف مصنف

ڈی۔ ایف۔ کراکا ہندوستان کا ایک متنازعہ فیہ اور منفرد پارسی صحافی رہا ہے جو بمبئی کے ہفت روزہ "کرنٹ" کا مشہور زمانہ ایڈیٹر اور کئی کتابوں کا مصنف تھا جن میں کئی ناول اور مہاتما گاندھی کی سوانح عمری "خاک سے نمو" اور "ہندوستان میں فریب" وغیرہ شامل ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا اس کا انتقال ہو چکا ہے۔

یہ اقتباسات اس کی اپنی حیرت انگیز سوانح عمری "پھر حضرت علیؑ آئے" (Then Came Hazrat Ali (AS)- Autobiography--1972) میں سے لئے گئے ہیں' جو ہندوستان میں شائع ہو چکی ہے جس میں اس نے حضرت علیؑ کے روضہ اقدس' واقعہ نجف اشرف' عراق میں اپنی تیسری (اور غالباً" آخری) حاضری کی روداد بیان کی ہے۔

یہ کتاب ڈی۔ ایف۔ کراکا کی سترہویں تصنیف ہے۔ جو ایک خاکی انسان کی سوانح عمری ہے ـــ ایک غیر مسلم ـــ جسے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے حقیقی داماد حضرت علیؑ نے ایک اچھوتے خواب میں زیارت کروا کر اپنی کرم گستری سے نوازا۔ یہ کوئی مذہبی صحیفہ نہیں ہے۔ جو ماجرا حضرت علی علیہ السلام کی نسبت بیان کیا گیا وہ مصنف کا ذاتی تجربہ ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے کراکا کی ذہنی کشمکش اور تبدیلی قلب کے غماض ہیں جنہیں قارئین کی دلچسپی کیلئے شامل کتاب کیا گیا ہے تاکہ قاری اس بات کی تہہ تک پہنچ جائے کہ حق کے جویا کس طرح چشمہ صداقت تک پہنچنے کیلئے تگ و دو کرتے ہیں۔ قدرت ان کی کن کن حالات و واقعات کے ساتھ امداد کر کے راہ نجات دکھاتی ہے اور وہ بالآخر اپنی سچی لگن کے ذریعے اپنا مقصد پا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بقول حافظ شیرازیؒ

ذرہ را تانبود ہمت عالی حافظ
طالب چشمہ خورشید درخشاں نشود

(ایک بے مقدار ذرہ ہمت عالی سے ہی چشمہ خورشید کا طالب ہو سکتا ہے)

ایک ایسا انسان جو آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ اور اس ی یونین کا پہلا ہندوستانی صدر ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا ہو۔ غیر منطقی بات پر آسانی سے یقین نہیں کر سکتا۔ لامحالہ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اسے اور اس کے اہل خاندان کو جن انوکھے تجربات زندگی سے گزرنا پڑا' ان کے اثرات نے اس پر مادی دنیا سے ماوراء ایک نئی روحانی دنیا کے دروازے وا کر دیئے اور ان ذاتی حادثات حیات نے اس کے مادی نقطہ نظر میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔

اس کتاب میں مصنف کا طرز بیان' جزئیات کی تفصیل اور خاص کر اس خواب کی روداد جس طرح اس نے بیان کی ہے' قابل داد ہے کیونکہ قاری اس طرح محسوس کرتا ہے جیسا کہ وہ خود سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور محسوس کر رہا ہو اور یہی مصنف کی صداقت اور کامیابی کی بین دلیل ہے۔

کتاب کے آخر میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ الصلوۃ و السلام کی 'زیارت' درج ہے تاکہ تمام مسلمین و مومنین اور مومنات اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کے ماننے والے' ان کے معتقد' انہیں چاہنے والے اور ان کی راہ میں مرمٹنے والوں میں جہاں ہر ملک و ملت کے لوگ شامل ہیں وہاں ہمارے وہ دینی بھائی بھی ہیں' جنہیں ان کی صحیح معرفت ہی نہیں ہونے دی جاتی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں کھرے کھوٹے کی پرکھ پیدا ہو جائے اور پھر جو ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام کے در پاک سے لگ کر کھڑا ہو گیا وہ کسی اور در کی طرف نہیں بڑھتا۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

چون تو بابی آں مدینہ علم را چون شعاعی آفتاب حلم را
باز باش ای باب بر جویای باب تار سند از تو قشور اندر لباب

ترجمہ:-

جب آپ (علیؑ) شہر علم (پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے دروازہ ہیں اور جب آپؑ حلم (رسول خدا صلعم) کے آفتاب کی شعاع ہیں۔۔۔

(تو) اے علم کے دروازہ کے طالب دروازہ پر کھلا رہ تاکہ آپؑ کی بدولت پوست یعنی ناقص درجہ مغز کمال کو پہنچ جائیں۔

مطلب:-

علم و اتباع مولای متقین حضرت علیؑ کی فضیلت کا بیان (ہے) جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے "انا مدینتہ العلم و علی بابہا"۔۔ (روایت از ترمذی)۔۔۔ یا "انا دارا لحکمتہ و علی بابہا"

--- میں علم و دانائی کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔

نیز "انا مدینتہ العلم و علی بابھا' فمن ارادالعلم فلیات الباب" --- میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں جو علم تک پہنچنا چاہے اس کو اس دروازے سے آنا ہو گا۔1

خدائے لم یزل ولا یزال کی بارگاہ احدیت میں مجھ حقیر کی یہ دعا ہے کہ اللہ پاک ہر مسلمان کو دولت علم و عرفان علیؑ عطا فرمائے جس کی روشنی میں وہ در اقدس رسول مقبول علیہ الصلوۃ و السلام تک رسائی حاصل کر سکے کیونکہ جو 'شہر علم' کے دروازے کو پا لے گا وہی شہر علم میں داخل ہو کر اس کی حقیقت کو پا سکے گا (آمین)۔ آپ بھی دعا کریں اور کرتے رہیئے کہ "رب زدنی علما"○"

اب ان کے وصف میں ہے موشگاف کلک رسا
زباں پہ ناد علیؑ ہے تو گاہ صلی علی
(غالب)

حقیر ذرہ در سید الکونین
بشیر حسین عفی عنہ

D.F. Karaka

This is D.F. Karaka's seventeenth book.

It is the autobiography of an earthy person, a non Muslim to whom Hazrat Ali, son-in-law of the Prophet Mohammed, appeared in a vivid dream in April 1954. Hence, the title — THEN CAME HAZRAT ALI, Autobiography 1972.

The book is not a religious book. The incident which relates to Hazrat Ali is the author's personal experience.

D.F. Karaka may need introduction to posterity; he certainly does not to his generation. He had the distinction of being elected President of the Oxford Union — the first Indian. He describes in this book the meaning of that achievement. He re-lives in the chapter, *Mr. President, Sir*, the weeks at Oxford after he had made headlines in the newspapers of the world. His predecessors in that office at the Union were Gladstone, Lord Salisbury, Lord Cecil, Lord Birkenhead, Sir John Simon, Lord Hailsham to mention but a few.

The book narrates a variety of episodes from Karaka's gay early youth — Oxford, Paris, women, cards, racing — right up to his six days' detention in jail in India in the December of 1971. As far as it is known, no other government in the world ever deprived a man of his liberty, who achieved the honour of becoming President of the Union at Oxford. Consequently, Karaka's last chapter *Into Jail* is somewhat unique; it is also one of the most moving pieces of writing of our time. Its power lies in its great restraint.

Karaka's powerful writing is interleaved with his terrific sense of humour. His early chapter *Introduction to Sex* would rate a high place in any anthology of humourists. This is understandable, for Karaka is the only one, ever to be entitled to call himself, "Mr. Punch's Learned Clerk in India", a literary title Malcolm Muggeridge bestowed on him during the latter's editorship of that classic English journal. For *Punch*, Karaka wrote over two dozen articles.

There is evidence of great humulity in D.F. Karaka's writing; yet alongside it, there is an abundance of egotism, self-assurance, arrogance, even conceit. Who wouldn't be who had the magnificent dream Karaka has had? The dream he describes for his reader as vividly as if the reader was seeing it himself.

Among those who read the manuscript of this book prior to its publication. Khushwant Singh, Editor of the Illustrated Weekly of India, referring to the author as an "epicurean, hedonist and sceptic", wrote: "Like everything else that he has written, it is immenesly readable, shorn of verbosity and commanding the reader's attention."

More pithy was the one line comment of Daniel P. Oleksiw, Head of the U.S.I.S in India, who said: "What a fantastic book!"

نجف اشرف

پہلی صدی سے پندرہویں صدی تک

دریائے فرات

دریائے فرات سے چار میل مغرب کی جانب ہٹ کر کوفہ کے قریب ایک بلند خطہ زمین پر بادلوں سے سرگوشی کرنے والا قبہ طلا ہے۔ جس کے نیچے محمد عربی کے بھائی --- اور خدا کے شیر --- علی ابن ابی طالب کی آرام گاہ ہے۔ اسی کو نجف اشرف کہتے ہیں۔

نجف کا ماضی

یہ معتدل زمین ہے باعتبار ہوا کے، اور صحت بخش ہے بہ لحاظ مزاج و پانی کے، اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندے عقل سلیم، وزنی رائے، خوبصورت شکل و شمائل، ہر فن میں دستگاہی۔ موزونیت اعضا تناسب اخلاط معتدل، گندم گوں رنگت کے ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کو بطن مادر میں برابر کی گرمی پہنچائی گئی ہے اور اس لئے وہ کالے سفید یا چتکبرے نہیں ہوا کرتے۔ یہ الفاظ حموی نے اپنی مشہور کتاب "معجم البلدان" میں عراق کے ضمن میں۔ لکھتے ہوئے نجف اشرف کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے "نجف اشرف کوفہ کی پشت کی جانب ایک پہاڑی کی چوٹی پر اب ہے۔ ہزاروں سال پیشتر سے آباد چلا آرہا ہے۔ اور جس کے دامن میں علی بن ابی طالب محو آرام ہیں۔ نجف اب سے پیشتر اپنے سرسبز و شاداب مرغزاروں، موتی جیسی جھیلوں کی بدولت "خدا لعذراء" (رخسارہ خاتون) کے دل آویز نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی بو قلمونیاں، گلہائے رنگا رنگ، ٹھنڈی اور شفاف ہوائیں مناوزہ و ساسانی و عباسی بادشاہوں کو دعوت گلگشت دیتی تھیں اور وہ اس سمت آکر سکونت کرتے تھے۔ جدھر سے "نجف" کی ہوا آتی تھی۔

یہ تھا نجف اشرف کی طبعی حالت کا سرسبز و شاداب ماضی کہ جو حضرت علیؑ کے سینکڑوں

برس بعد تک ہا' مگر ابھی تقریباً ایک قرن قبل کی بات ہے کہ صفحہ نجف نے قدرت کی ایک ادنیٰ مگر بر مصلحت جنبش پر جو پیٹا کھایا تو وہی نجف جو کبھی ایک بحر عظیم کے کنارے اپنے دامن میں مہکتے گلزاروں اور بہتی ہوئی نہروں کو لیے ہوئے تھا۔ ایک ریگستان کی صورت میں مبدل ہو گیا۔ اس طرح اس کا دامن رنگین گلوں سے تو ضرور خالی ہو گیا۔ مگر ان کے بدلے درہائے آبدار سے پر ہو گیا۔ آج بھی وادی السلام میں جستجو کرنے والے کا دامن درہائے نجف سے بھر جاتا ہے۔ لیکن ان دودھ کی طرح سپید و شفاف موتیوں سے نورانی تر اور بدر جہا اشرف وہ جواہر علمی ہیں۔ جن کو نجف قرنوں سے عالم پر نچھاور کر رہا ہے۔

نجف اشرف کا جغرافیہ

نجف اپنے طول البلد کے لحاظ سے 44 درجہ مشرق اور عرض بلد کے اعتبار سے 32 درجہ دودقیقہ طرف شمال اور سطح بحر سے تقریباً 70 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور زمین ریگستانی ہونے کی وجہ سے حرارت و برودت اتنی زائد قبول کرتی ہے۔ کہ گرمی میں اس کا درجہ حرارت 45ء5 تک پہنچ جاتا ہے' جبکہ سردیوں میں صفر سے بھی گر جاتا ہے اور پانی منجمد ہو جاتا ہے۔

نجف کے نام

نجف کے بہت سے اسماء ہیں جن میں سے بعض وہ ہیں۔ جن کا ذکر صرف اخبار اہل بیت میں ملتا ہے جیسے طور' ظہر' جودی' ربوۃ' وادی السلام' بانقیا' اللسان اور بعض وہ ہیں کہ حولسان آئمہ اور دیگر افراد میں مشترک ہیں۔ جیسے نجف' عربی مشہد۔ ان تمام اسماء کی الگ الگ وجہ تسمیہ بھی ہے۔ لیکن ہم اس وقت سب سے مشہور نام کی وجہ تسمیہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

نجف کی وجہ تسمیہ کے متعلق بہت سے وجوہ بیان کئے جاتے ہیں کہ جن میں سے ہم یہاں وہ وجہ ذکر کرتے ہیں جس کو لسان نے بیان فرمایا ہے --- شیخ صدوق علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادق سے یہ روایت کرتے ہیں۔ "حضرت نے فرمایا نجف ایک عظیم الشان پہاڑ تھا اور یہ وہی پہاڑ تھا جسے دیکھ کر فرزند نوح نے کہا تھا میں پہاڑ پر پناہ لوں گا۔ جو مجھے پانی کے عذاب سے بچا سکتا ہے۔ اس پر خداوند کریم نے اس سے خطاب کیا کہ کیا تجھ میں یہ طاقت ہے کہ میرے عذاب سے بچا لے؟ یہ خطاب سن کر پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور بہت باریک رمل کی

صورت میں مبدل ہو کربلا و شام میں منتشر ہو گیا اور پھر اس کی جگہ عظیم الشان سمند مارنے لگا کہ جس کا نام (نے) پڑ گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ سمندر خشک ہو گیا تو کہا گیا "نی نجف" (یعنی نے) خشک ہو گیا۔ اس کے بعد نجف کہنے لگے۔ آخر سہولت کی وجہ سے نجف کہا جانے لگا۔

مرقد علوی

چشمہ آفتاب سے نگاہیں لڑانے والا عظیم الشان سنہری قبہ اور اونچے بادلوں سے سرگوشیاں کرنے والے خالص سونے کی میناران پر رات کے وقت دور سے چمکتی ہوئی دلفریب روشنیاں ہوتی ہیں۔ حرم اقدس کی جھلملاتی محرابوں کے نیچے اور ریشم سے زائد نرم و نازک بیش بہا قالینوں کے اوپر بہت سے چلنے والے زائروں کو اس وقت کا کیا اندازہ ہو جب یہ شوکت بارگاہ ایک پرحسرت قبر تھی کہ جو دیجور کے پردے میں لوگوں کی آبادی سے ہٹ کر دشمنوں کی نگاہوں سے چھپا کر بنائی گئی تھی۔ اور جس کے جاننے والے صرف حسنؑ اور حسینؑ و محمد حنفیہ میثم تمار، صعصہ بن عوحان، قیس بن سعد و حجر بن عدی و دیگر چند گنتی کے اقربا و احباب تھے۔ اور ان کو بھی تاکید یہ تھی کہ وہ اس راز کو سینے کا دفینہ کر دیں اور کسی پر مزار مقدس کو ظاہر نہ کریں۔

مورخین عامہ اور مزار علیؑ

جب تک قبر امیر المومنین دشمنوں کے خوف سے پوشیدہ رہی، اس وقت تک چند خاص پروانوں کے سوا کسی کو اس کا پتا نہ چلا، مگر جب یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اہل بیت طاہرین جو اس کے حامل تھے۔ وہی اس کا اعلان کرنے لگے۔ داوٗد، ہارون جیسے افراد کو قبر اقدس پر عمارت بنانا پڑی تو عام مسلمانوں کو اس کے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ابو الفرج اسفہانی، ابن ابی حدید طبری، ابن اثیر، ابوالفدیٰ، ابن جوزی، ابو شجنہ وردی اور دوسرے مورخین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ آپ کا مزار پاک نجف اشرف میں ہے اور خاص و عام کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ اعثم کوفی نے کتاب فتوح میں لکھا ہے، نجف و غزیٰ ایک جگہ کے دو نام ہیں۔ اس طرح جملہ مورخین عامہ و علمائے اہل سنت نے حضرت کی قبر اطہر کا اپنی اپنی کتابوں میں صریح ذکر کیا ہے۔

تعمیر اول

قبر مبارک اسی طرح شب و روز لوگوں کی زیارت گاہ بنی رہی۔ لیکن کسی قسم کی تعمیر سے

اب تک خالی تھی۔ یہاں تک کہ داؤد بن علی عباس کوفی (133ء) نے اس پر ایک صندوق بنوایا۔ یہ واقعہ سید ابن طاؤس علیہ الرحمتہ نے فرحتہ الغریٰ میں یوں تحریر کیا ہے۔

جب داؤد عباسی نے جو اس وقت کوفہ کا حاکم تھا۔ لوگوں کا ہجوم قبر مبارک پر دیکھا تو اس نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ معمار لائے جائیں۔ پھر ان معماروں کو اپنے ایک حبشی غلام کے ہمراہ جس کا نام "جمل" تھا اور جو قوت و تیاری میں بہت زائد تھا نجف روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہاں جو قبر ہے اس کو کھودو۔ اس کی تہہ میں سے جو کچھ برآمد ہو' میرے پاس لے آؤ' کیونکہ یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی قبر ہے۔ اسماعیل بن عیسیٰ عباسی کا بیان ہے کہ میں بھی ان لوگوں کے ہمراہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ مقام مذکورہ پر پہنچے' تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اپنا کام شروع کرو۔ چنانچہ عمال کھدائی میں مصروف ہوئے۔ اور وہ لوگ لاحول پڑھتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب پانچ ہاتھ کی گہرائی تک پہنچے تو انہوں نے کہا کہ اب ہم ایک ایسی سخت چٹان تک پہنچے کہ جس کو کھودنے پر ہم قادر نہیں ہیں۔ پھر ان لوگوں نے اس گڑھے میں اس طاقت ور حبشی کو اتارا اور حبشی نے کدال ہاتھ میں لیکر پوری قوت سے چٹان پر ماری کہ اس کی گونج تمام جنگل میں گونج اٹھی۔ اس کے بعد اس نے دوسری چوٹ ماری اور پہلی مرتبہ سے زیادہ آواز آئی۔ پھر تیسری مرتبہ ضرب ماری اب کی دفعہ بڑی شدت کی آواز نکلی اور ساتھ ہی غلام نے ایک زور دار چیخ ماری۔ یہ سن کر ہم لوگ اٹھے اور اس گڑھے میں جھانکنے لگے میں نے اس کے ساتھیوں سے کہا پوچھو تو اس پر کیا گزری۔ ان لوگوں نے پوچھا مگر اس کی حالت جواب دینے کے قابل نہ تھی۔ وہ برابر چیخیں مارے جا رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا ہم نے اس کو نکال کر ایک خچر پر لادا اور کوفہ کی طرف واپس چلے کہ اتنے میں غلام کو گوشت اس کے بازو سے اور داہنی جانب سے پھٹ کر گرنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں اس کے سارے جسم کی یہ حالت ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ داؤد کے پاس پہنچے اس نے پوچھا کیا ہوا۔ ہم نے غلام کی طرف اشارہ کر کے کہا خود دیکھ لو اور پھر سارا ماجرا بیان کیا۔ یہ سن کر اس نے قبلہ کی طرف چہرہ پھیر کر خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کی اس کے بعد ایک رات داؤد علی بن مصعب بن جابر کے پاس آیا۔ اور اس سے کہا کہ قبر مبارک پر ایک صندوق بنا دے لیکن اصلی قصہ اس سے مخفی رکھا چنانچہ قبر پر اس کے حسب حکم صندوق بنایا گیا اور غلام جمل مرچکا تھا۔

عمارت ثانیہ 155ھ

سلطنت بنو امیہ کے خلاف اور بنو عباس کی طرف دعوت دینے والے اپنی تقریروں میں بنی

فاطمہ و آل رسولؐ کے فضائل اور بنو امیہ کے ان پر شدید مظالم بیان کر کے لوگوں کو مائل کرتے تھے۔ اور اس حکمت عملی کے ماتحت آل رسولؐ کی ابتدائے امر خلافت میں پاسداری بھی بہت کی جاتی تھی۔

لیکن جوں جوں خلافت کی جڑیں استوار ہوتی گئیں، حکومت کی نظریں بھی بنی فاطمہ کی طرف سے پھرتی گئیں۔ اور بالاخر وہ وقت پھر آگیا کہ جس میں ان پر دنیا پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہو گئی ---- لہٰذا بوجو خوف و ہراس مزار حضرت علیؑ پر لوگوں کی آمدورفت کا وہ سلسلہ جو سفاح کے دور میں جاری ہوا باقی نہ رہ سکا اور مزار اقدس پر دوبارہ حسرت برسنے لگی رفتہ رفتہ وہ صندوق بھی خرد برد ہو گیا جو داؤد نے بنایا تھا۔ کیونکہ خلفا کے جور و ظلم سے اس کو بھی اس کی خبر گیری کی ہمت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ آیا جب حضرت علیؑ کی قبر مبارک پہلے کی طرح خاک کے اندر روپوش ہو گئی اور اس کو اتنا عرصہ گزر گیا کہ ہارون رشید تخت خلافت پر بیٹھا اور ایک واقعہ کے ماتحت اس کو قبر کا حال معلوم ہوا اور پھر اس نے اس پر روضہ بنوایا۔ اس واقعے کو عمدۃ المطالب و ارشاد القلوب و دیگر کتب نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

ہارون رشید ایک روز پشت کوفہ پر شکار کی غرض سے نکلا تو اس کو کچھ خچر اور آہو نظر آئے۔ اس نے ان کے پیچھے اپنے شکاری کتے ڈال دیئے اور خود بھی ان کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان حیوانوں نے بھاگنا شروع کیا اور بالاخر ربوات بیض کے وسط میں آکر رک گئے۔ ہارون نے خیال کیا کہ شاید ان لوگوں کہ بیچ میں کوئی چیز ہے جس کو دیکھ کر یہ کتے رک گئے ہیں پھر جب کتے اس مقام سے ہٹا لئے گئے تو ہرن باہر نکلے کتے پھر دوڑے اور ہرن نے پھر وہیں پناہ لی اور کتے اس جگہ کے اندر نہ گئے۔ ہارون کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور اس نے وہاں کے پیرو مرد و زن کو بلا کر یہ واقعہ بیان کیا اور وجہ دریافت کی۔ ان میں سے ایک بڈھے نے کہا اگر جان کی امان پاؤں تو اس راز کو عرض کر دوں؟ ہارون نے کہا تو مامون ہے بیان کر! اس نے کہا ان ٹیلوں کے وسط میں حضرت علیؑ کی قبر مبارک ہے۔ رشید کو اس بات کا یقین ہو گیا اور اس نے پیر مرد کو انعام اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور پھر اس نے قبر مبارک پر ایک روضہ تعمیر کیا۔ اس پر برنگ سرخ ایک قبہ بنایا۔ اس میں سبز رنگ کی خوبصورت قندیل آویزاں کی اور قبہ کے چار دروازے چار سمتوں پر بنوائے۔ ایک مدت دراز کے بعد جب تعمیر کی گئی تو یہ قندیل حضرت کے خزانہ میں دستیاب ہوئی۔ اس قبہ کے علاوہ ہارون الرشید نے سفید پتھر کی ایک ضریح بھی قبر مبارک پر تعمیر کی۔ ایک انتہائی خوش نما تصویر جو قلمی زدہ بلوری پلیٹ پر بنائی گئی ہے اب تک حضرتؑ کے خزانہ میں موجود تھی جس میں آہو اور ہارون کے شکار کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویر

فن مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور سابق شاہ ایران (محمد رضا شاہ) کی بنوائی آئینہ کاری کے موقع پر حضرت کے بالائے سر آئینوں میں ملا کر جڑ دی گئی ہے۔

تیسری تعمیر 279ھ

روضہ اقدس کی تیسری تعمیر محمد استجا زید الداعی نے کی اور اس نے قبر شریف پر قبہ چاردیواری اور ایک ستر طاق کا قلعہ تعمیر کیا۔

چوتھی تعمیر 360ھ

روضہ اقدس کی ہونے والی چوتھی تعمیر عضدالدولہ کی ہے۔ تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ عمارت اپنے وقت کی بہترین عمارتوں میں سے تھی۔ اور اس عہد میں انسانی قدرت کی جتنی دسترس تھی وہ اس پر صرف کر دی گئی تھی۔ ارشاد القلوب دیلمی میں ہے کہ عضدالدولہ ان اطراف میں آکر تقریباً ایک سال کی طویل مدت تک اقامت گزین رہا اور اس نے اطراف عالم سے بہترین صناع و استاد ان فن معماری کو طلب کیا اور پہلی عمارت کو خراب کر کے کافی دولت سے ایک بہترین روضہ تعمیر کیا کہ جو آج سے قبل تک باقی تھا۔ اور اس کے لیے بہت سے اوقاف بھی قائم کیے اور شہر کو آباد کیا' بازار بنوائے' شہر پناہ کی دیوار کو مضبوط کیا۔

اس عمارت کا مشاہدہ مشہور سیاح اسلام ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے جبکہ وہ 727ھ میں وارد نجف ہوتے ہیں چنانچہ وہ کیفیات حرم القدس بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ یعنی رافضی چوکھٹ چومنے کو کہتے ہیں کہ جو خالص چاندی کی ہے اور پہلو کا چوکھٹا بھی چاندی کا ہے۔ اس کے بعد قبہ میں داخل ہوتا ہے کہ جس کے اندر انواع و اقسام کے ریشمی فرش بچھے ہیں اور طرح طرح کی سونے کی قندیلیں آویزاں ہیں۔ اور قبہ کے وسط میں ایک ایوان ہے۔ یہ اگرچہ لکڑی کا ہے مگر اس کے اوپر ہر طرف سے منقش سونے کے پتر چاندی کی کیلوں سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ لکڑی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی بلندی قد آدم ہے اور اس کے اوپر تین قبریں ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حضرت آدم و نوح و حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قبریں ہیں۔ ان قبروں کے درمیان سونے چاندی کے طشت رکھے ہیں کہ جن میں گلاب و مشک کا پانی و دیگر عطریات پڑے رہتے ہیں۔ اور زائر اس میں سے ایک چلو بھر کر اپنے منہ پر تبرکاً" ملتا ہے۔ قبہ کی پشت پر ایک عقبی دروازہ ہے یہ بھی چاندی کا ہے۔ جس پر رنگین ریشمی پردے پڑے ہوتے ہیں یہ دروازہ ایک مسجد میں کھلتا ہے جس میں حرم کی طرح ریشمی' فرش بچھے ہیں اور اس

کی دیواریں و چھت بہترین خوشنما پردوں سے روپوش ہیں۔ مسجد کے چار دروازے ہیں جن کی چوکھٹیں چاندی کی ہیں اور ان پر ریشمی پردے ہیں۔ اس کے بہت سے امرا و سلاطین شیعہ و غیر شیعہ مثلاً ناصر خلیفہ عباس و خدا بندہ و چنگیز خان و ابن مہدی وزیر وغیرہ اس روزہ کی تعمیر میں برابر حصہ لیتے رہے اور سونا چاندی چڑھاتے رہے اور دیواروں پر ساج کی لکڑی کے نقوش تو اس کثرت کے ساتھ لگائے کہ بالآخر اس میں کسی کے ہاتھوں آگ لگ گئی۔

پانچویں تعمیر 760ھ

یہ آگ 755ھ میں لگی جس نے حرم اقدس کی تمام زینت کو برباد کیا لیکن اس کے بعد ہی اویس بن حسن جلاتری نے فوراً تعمیر کا ارادہ کیا اور چند ہی روز میں روضہ کو پہلے کی طرح شاندار بنا دیا۔ اس نے ساج کے بجائے دیواروں پر خام ایک پتھر سے زینت دی کہ جس میں بہترین نقش و نگار کئے گئے تھے۔ انہی ایام میں اتفاق سے بغداد میں گرانی پڑی جس کی وجہ سے لوگوں نے کتابیں فروخت کرنا شروع کیں جن کو اہل نجف نے غلہ کے مول کافی تعداد میں خرید لیا۔ اس طرح لاتعداد بہترین کتب سے حضرت کا خزانہ مملو ہو گیا۔

چھٹی تعمیر 914ھ

شاہ اسمٰعیل نے ایک ضریح تعمیر کی جو فولاد کی بنی ہوئی تھی اور اس کے اندر حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ و حضرت علیؑ کے الگ الگ صندوق بنوائے اور روضہ اقدس کی رنگ برنگ قندیلوں سے تزئین کی۔

ساتویں تعمیر 1033ھ

اس سال شاہ صفوی شاہ عباس نے تعمیر کی اور صحن کو کشادہ کیا اور قبہ کو مضبوط کیا۔ ضریح کی مرمت کی اور فرش بنوائے اور ایک ضیافت خانہ بنوایا۔

آٹھویں تعمیر 1047ھ

اس سال صفی صفوی شاہ عباس کے پوتے نے تعمیر میں حصہ لیا اور قبر اطہر کو رخام کا بنایا اور رقبہ کو دومنیاروں کے بیچ میں پھر سے تعمیر کیا۔ رواق بنوایا' رواق روکار میں ایوان کی تعمیر میں صحن میں اوپر نیچے کمرے بنوائے قبہ کو کاشانی سے زینت بخشی اور مقام کے چھ دروازے بنائے دو

بالائے سر و دو پائین پا اور دو پہلوؤں میں۔ رواق میں پانچ دروازے کھولے اور صحن میں بھی تین جہتوں میں تین دروازے لگائے۔

نویں تعمیر 1155ھ

اس سال نادر شاہ نے قبہ پر سونا چڑھایا اور اس کے داخلی حصہ کو کاشی سے آراستہ کیا اور صندوق ضریح کی مرمت، صندوق کے آگے اپنا تاج رکھا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے دونوں منارے بھی سونے کے بنوائے جس نے تاریخ کہی گئی "سعدا عظیما" یہ تاریخ بائیں منارے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ضریح بھی کسی صاحب خیر کی طرف سے چاندی کی کر دی گئی اور اس شخص کی جانب سے صدر دروازے پر گھڑی لگائی گئی۔

حرم علوی و ملا طاہر سیف الدینؒ

موجودہ روضہ شاہ صفی صفوی کا بنوایا ہوا ہے۔ جو فن کا ایک عجوبہ ہے۔ قواعد علم ہندسہ خوبصورتی اس کے رکن امتیازی ہیں۔ اس روضہ اقدس میں یوں تو آئے دن نئی نئی اصلاحیں ہوتی رہتی ہیں۔ بائیں طرف کا منارہ سونے سے کھود کر دوبارہ بنایا گیا۔ سال میں ہزاروں دینار اس کی مرمت وغیرہ میں صرف ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ماضی قریب میں جو خاص اصلاحیں ہوئی ہیں اس میں امیر البواہیر ملا طاہر سیف الدین کی پیش کردہ ضریح کو بڑا دخل ہے۔ یہ ضریح عظمت مضبوطی، نزاکت جیسی سیرالاجتماع خصوصیات کی حامل ہے۔ آپ ہی نے حرم کی دیواروں اور فرش میں ایک خاص قسم کا پتھر لگایا ہے جو اتنا شفاف ہے کہ اس میں صورت دکھائی دیتی ہے۔

خالص سونے کا دروازہ

کچھ عرصہ گزرا ہے کہ خبر سننے میں آئی کہ کوئی بادشاہ نہیں بلکہ ایک غیر معروف ایرانی تاجر دس لاکھ تومان (ساڑھے چھ لاکھ روپے) صرف کر کے ایک باب الزہب بنوا رہا ہے۔ پھر یہ خبر خبر کی حد سے نکل کا عالم فعلیت میں بھی آ گئی۔ جبکہ ایک شاندار خالص سونے کا دروازہ جو اپنے طول و عرض میں پہلے چاندی کے دروازے سے تقریباً دوگنا بڑا تھا۔ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لا کر نصب کر دیا گیا۔ اس موقع پر اہل نجف نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اطراف کے عرب اس سونے کے چمکتے ہوئے اور شیشہ کی طرح صاف نائیلون کی چادروں سے ڈھکے ہوئے خوشنما در کو بڑی حیرت سے دیکھتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اس بیش قیمت

دروازہ نے صحن کی شان کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ سونے کا پھاٹک' سونے کی دیواریں' سونے کے مینار اور ان کے بیچ میں سونے کا عظیم ہیکل قبہ دیکھنے سے پورا روضہ سونے کا ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس طلا کاری کی اس دین و دنیا کے بادشاہ کے آگے کیا حقیقت جس کی ایک ٹھوکر پر سونے کے دریا ابل پڑتے تھے۔ اور اتنے اقتدار کے باوجود جس کو خاک پر بیٹھ کر نان جویں توڑنے ہی میں مزا ملتا تھا۔ البتہ ان چیزوں سے عقیدت مندوں کو امام کی بارگاہ میں اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل گیا۔ نیز اس طلا کاری سے حضرت کے ایک ارشاد کی بھی تصدیق ہو گئی کہ جس میں آپ نے دنیا کی کج رفتاری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا "من لسا عاھا فاتتہ و من قعد عنھا اتتہ" (نہج البلاغہ) یہ دنیا وہ ہے کہ جو اس کو پانے کیلئے اس کے پیچھے دوڑتا ہے یہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔ اور جو اس سے روگردانی کر کے بیٹھ جاتا ہے کہ اس کے پاس آموجود ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ نے چونکہ دنیا کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ اس لئے وہ آج بھی آپ کے پیروں میں لگی بیٹھی ہے۔ ———————— بشکریہ قومی ڈائجسٹ ۱۹۸۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(البقرہ - آیت ۶۲)

بے شک جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہیں اور نصرانی اور صائبین (ستارہ پرست یا لامذہب) جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور نیک اعمال کئے تو ان کا اجر و ثواب ان کے رب کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے

سہیل سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد یونٹ نمبر ۸ - C1

ابتدائیہ

ستمبر سال گزشتہ (یعنی 1971ء) میں، میں نے تیسری بار نجف اشرف کی زیارت کی۔ اس سے پہلے میں 1968ء اور 1970ء میں وہاں جا چکا تھا۔ نجف اشرف عراق میں بغداد سے ایک سو اسی کلو میٹر جنوب مشرق میں واقع ہے جہاں پر حضرت علی علیہ السلام مدفون ہیں۔

ان کے مزار پر میں نے پہلی حاضری اپنی شدید علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد دی تھی۔ یہ حاضری ان کی بارگاہ میں ان کے کئی سال قبل خواب میں، مجھے زیارت کرانے کے اظہار تشکر کے طور پر تھی۔ حضرت علیؑ نے خواب میں اپنے روئے مبارک کو بے نقاب کیا تھا۔ انہوں نے اپنا دست مبارک میری طرف بڑھا کر میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر مجھے اپنی طرف کھینچا تھا۔ یہ واقعہ میرے حافظے میں ایسا نمایاں ہے جیسے یہ کل رات ہی وقوع پذیر ہوا ہے۔

میں کبھی مذہبی آدمی نہیں رہا۔ میں اب بھی کسی دھرم کی مقررہ حدود کا پابند نہیں ہوں۔ میں یقیناً پرماتما کی ذات کو مانتا ہوں لیکن مجھ میں عام انسان کی تمام کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ کوئی جامعیت میرا مقصد نہیں ماسوا اس کے جو قدرتی انداز میں مجھ تک پہنچے۔ **میرا ایمان ہے کہ مذہب ایک رسم نہیں ہے بلکہ یقیناً ایک قلبی کیفیت ہے۔ میرے نزدیک بندگی یکسوئی چاہتی ہے۔ یعنی یہ انسان کی عاجزی کا ثبوت ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنی (بکھری) روح کو سمیٹتا ہے۔**

میں مسلمان نہیں ہوں۔ مجھے جیسا کہ میں پیدا ہوا تھا اس کے علاوہ کچھ اور بننے کی ضرورت نہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے آباؤ اجداد قدیم فارس سے عربوں کے حملے کے وقت بھاگے تھے صرف مذہب اسلام اختیار کرنے سے بچنے کی خاطر!

تاہم میں وہ انسان ہوں جس کے پاس حضرت علی علیہ السلام خواب میں تشریف لائے۔ میں اسے بڑے فخر کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہوں۔ اگرچہ اس میں کچھ مغرورانہ خود ستائش کا شائبہ بھی پایا جائے۔ یہ تعلی میں نے اپنے طور پر حاصل کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں انکساری سے محروم ہوں لیکن میرے نجف اشرف کے حالیہ سفر کے بعد مجھے صحیح اندازہ ہو چکا ہے کہ مجھے کب اور کیسے "عجز" اختیار کرنا چاہیئے۔

1949ء میں، جب میں نے اپنا ہفت روزہ "کرینٹ" جاری کیا، میں بے حد ذہنی خلجان میں مبتلا تھا کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ مستقبل میں مجھے کیا پیش آئے گا۔ میری ماں کی سہیلی ایک پابند مذہب پارسی خاتون کے ذریعے (عرصہ ہوا، دونوں فوت ہو چکی ہیں) مجھے "ایک پیغام" ملا تھا۔ گجراتی زبان میں بھیجے گئے پیغام کے آخری الفاظ یہ تھے "میں ہمیشہ تمہاری مدد پر مستعد ہوں۔ ہمت پکڑو۔"

یہ "پیغام" کس نے بھیجا تھا؟ پارسی خاتون نے بتایا کہ یہ "باوا" کی طرف سے تھا۔ کون "باوا"؟ میں حیران تھا۔ اس وقت مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ مہارشی تھا۔ بالآخر اس واقعہ کے پانچ سال بعد، ایک خواب دیکھنے کے بعد، مجھ پر... منکشف ہوا کہ وہ بزرگ جنہوں نے "پیغام" بھجوایا تھا کہ "وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہوں گے" ___ وہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ کئی برس تک حضرت علیؑ میرے لئے ایک پرکشش اجنبی بنے رہے۔ مجھے ان تک بار بار رسائی حاصل کرنے میں جھجک مانع رہی اور میں انہیں صرف حالت مصیبت یا ضرورت کیلئے مستعد و مختص سمجھنے پر مکتفی رہا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ میں ان سے کیا مانگوں اور ان کے خواب میں ظاہر ہونے کے کیا صحیح معنی ہو سکتے تھے؟ ان کے ساتھ اٹھارہ سالوں کی مسلسل گہری موانست اور روزانہ عبادت کے بعد میں ان سے ایک ناقابل بیان قربت محسوس کرتا ہوں۔

نجف اشرف کیلئے میرے پہلے دو سفروں کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کرتا تھا کہ میں ایک عظیم ولی کے مزار مقدس کی زیارت کو پہنچا تھا۔ مگر اس مرتبہ جب میں نے اس روضہ اقدس کے اندر قدم رکھا تو مجھے ایسے لگا گویا میں اپنے پتا کے پاس جا رہا ہوں۔ بغیر لگی لپٹی کے میرا احساس یہی ہے۔ میرے اندر جو تحیر خیز، بھرپور اور شاندار احساس تکمیل پیدا ہوتا ہے وہ یونہی مجھے چاندی کی طشتری میں سجا کر نہیں دے دیا گیا۔ اس سال فروری سے لیکر اب تک میں نے "یا علیؑ" کے الفاظ کو پانچ لاکھ مرتبہ سے زیادہ پڑھا ہے۔ یہ وظیفہ یا "پکار" تقریباً میرا جزو و جان بن چکی ہے۔ میں فی الواقعہ ہر اٹھتے ہوئے قدم پر اسے پڑھتا ہوں۔ تاہم میں ان الفاظ کو بلند آواز سے پڑھوں تو مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھے سرزنش کر رہے ہوں "تم اتنی اونچی آواز سے کیوں پکارنے لگے؟ میں تو ہر وقت تمہاری مدد کیلئے موجود ہوں۔"

یہی علیؑ ہیں، میرے علیؑ ___ وہ سب کیلئے موجود ہیں۔ لیکن ان کی ہمہ وقت قربت حاصل کرنے کیلئے اس جیسے اندھے اور کامل یقین کی ضرورت ہے جو مجھے حاصل ہے۔ اس رشتہ خلوص کیلئے منطق اور توجیہ کام نہیں آتے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ میں نے ایک خواب

کے ذریعہ اپنے لئے ایک ایسا ذہنی تصور قائم کر لیا ہے جس کے ساتھ میں سالہا سال سے جی رہا ہوں۔

اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ متنوع لباسوں میں میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے مختلف شخصوں کی معرفت ہم کلام ہوتے ہیں' کئی ایک باتیں جو مجھ سے مخاطب ہو کر کہی گئیں اور میرے خیال میں حضرت علیؑ سے مخصوص ہو سکتی ہیں' کسی انگریز بچے یا ایک عراقی ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے ادا ہوتی ہیں جس کے متعلق مجھے قطعاً" گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ ان کی طرف سے پیغام بر ہو سکتا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ کب حضرت علیؑ مجھ سے مخاطب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کبھی ایک لفظ بھی مجھ سے بالمشافہ نہیں فرمایا۔ کبھی کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں صوفیا کے تجربات کے مطابق کوئی "آواز" نہیں سنتا۔

ہاں تو میں تیسری بار نجف اشرف جا رہا تھا

جونہی ہمارا جہاز بغداد کے ہوائی اڈے پر اترا میں نے اپنا کالر اور ٹائی درست کئے' دو حکومتوں کے نمائندوں کو میری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ کوئی نہ کوئی اس بھری گرم دوپہر میں یہاں تک میرا استقبال کرنے آئے گا۔ مگر مجھے مایوسی ہوئی کہ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہم ایک ٹیکسی میں ہوٹل پہنچ گئے۔ ایک دینار' پچیس روپے کرایہ تھا۔

نجف اشرف کی راہ میں

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے فون پر کال بک کروا کر نجف اشرف کے گورنر سے رابطہ قائم کیا۔ "وہ کل آپ کا انتظار کریں گے" ترجمان نے مجھے اطلاع دی۔ نجف اشرف ہی ہماری منزل مقصود تھی اور وہاں کا گورنر "ہمارا منتظر" تھا۔ چنانچہ سب ٹھیک تھا۔

شام کے وقت' ہم ہوٹل کے قدمچے پر پہنچے تاکہ دوسرے روز کیلئے سواری کا بندوبست کیا جائے۔ کئی ہوشربا بھاؤ سننے میں آئے حتیٰ کہ آخر میں ایک ٹیکسی ڈرائیور جو دوسروں سے قطعاً" منفرد تھا' دوسروں کو ادھر ادھر دھکیل کر آگے بڑھا اور کہا "نجف؟ میں تمہیں وہاں لے جانے اور لانے کے نو دینار لوں گا---" وہ بلند قامت اور صحت مند تھا بعینہٖ جیسا کہ میں نے انہیں (حضرت علیؑ) کو اپنے خواب میں دیکھا تھا۔

"آٹھ" میں نے دوسروں کو بتائے گئے ریٹ میں آدھے دینار کا اضافہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا' پھر انگلی میری طرف نچا کر کہنے لگا "تم اتنا طویل

سفر کر کے امام علیؑ کی زیارت کیلئے آئے ہو اور اب مجھ سے ایک دینار پر تکرار کر رہے ہو۔"

اس کے الفاظ میں سچائی تھی۔ کسی ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ اس کی بات میں معنویت کا پایا جانا بھی اتفاقیہ تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

دوسرے روز ہم ناشتہ کر کے کربلا کے راستے نئی پختہ سڑک سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیور اس بات پر تلا ہوا تھا کہ ہم کربلائے معلیٰ میں ضرور رکیں کیونکہ یہ ایک المناک جنگ کی جائے وقوع تھی۔ یہاں حضرت علیؑ کے بیٹوں حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے اور مدفن ہیں جو اس راہ میں شہید ہوئے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا "نہیں" میں نے جواب دیا--- "سیدھے نجف چلو" ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتانا ضروری سمجھا کہ تمام سیاح پہلے کربلا میں رکتے ہیں۔

"نجف اشرف کی طرف" میں نے دہرایا کیونکہ مجھے اپنی منزل کا یقین تھا۔ اکثر مجھے دوسروں کو یہ بتانے میں مشکل پیش آتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے روضے اور میرے درمیان جو ربط ہے وہ واقعتاً" ایک ذاتی معاملہ ہے جس کا کسی مذہب میں کوئی جواز نہیں ہے۔

نجف سے پانچ کلو میٹر ادھر وہ جانا پہچانا افق میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کا سنہری نقطہ حجم میں بڑھتا گیا حتیٰ کہ میں نے حضرت علیؑ کے روضے کے گنبد کو پہچان لیا جو ستمبر کی روشن ابتدائی دوپہر میں دمک رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک ہلچل محسوس کی اگرچہ میں بظاہر پوری طرح پرسکون تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے اپنے پاس حاضری کا اذن عطا فرمایا تھا۔ میرے نزدیک یہ حضرت علیؑ کی طرف مراجعت تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان کا نام ایک سو دس مرتبہ لیا جیسا کہ میں کرنے کا عادی ہوں۔

نجف پہنچ کر پختہ سڑک ختم ہو گئی۔ سڑک ناہموار گرد آلود اور خاکستری زمین میں بدل گئی۔ ڈرائیور نے پوچھا "سیدھے روضہ کی طرف؟" یہیں مجھ سے سب سے بڑی حماقت سرزد ہوئی۔ ایک عمارت کے باہر کھڑے سنتریوں کو دیکھ کر میں نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ گورنر نجف کا دفتر تھا۔ اتنا اونچا آفیسر راہ دیکھ رہا تھا جس کے لئے میں ایک تعارفی خط لئے ہوئے تھا۔ میں اپنے احمقانہ پن میں بھول گیا کہ ایک اس سے بھی عظیم تر ہستی اس روز نجف میں میری منتظر تھی--- میں حفظ مراتب کا احساس کھو بیٹھا۔

ہم گورنر کے دفتر کے طویل کمرے میں پہنچ گئے۔ میرے خاندان کی لڑکیاں عبائیں پہنے میرے ساتھ تھیں۔ عبا ایک عرب عورت کا روایتی لباس ہے۔ یہ جسم کو سر سے پیر تک ڈھانپ لیتا ہے مگر چہرہ کھلا رہتا ہے۔ یہ برقع سے مختلف ہوتا ہے۔

گورنر خلیق تھا۔ اس نے تعارفی خط پڑھنے کے بعد (روضہ کے) بڑے کلید بردار کو فون کیا جو روضے کی دیکھ بھال کیا کرتا ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ فون کرنے والے آدمی نے مجھ سے اچانک میرے مذہب کے بارے میں استفسار کیا۔ "مذہب؟" پچھلی مرتبہ حضرت علیؑ کے روضے کی زیارت کرتے ہوئے مجھ سے کسی نے مذہب کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا۔

گورنر کے معاون نے میری طرف سے اثبات میں جواب کی توقع کرتے ہوئے، میری مدد کے انداز میں کہا "آپ مسلمان ہیں؟" میں نے انکار میں اپنا سر ہلایا اور کہا "نہیں"۔

میں "اپنے علیؑ" کے روضے پر دروغ گوئی نہیں کروں گا۔ "نہیں" میں نے دہرایا "میں مسلمان نہیں ہوں"۔ اس کے بعد فون پر عربی میں خاصی گفتگو ہوئی اور بعد میں گورنر اور اس کے معاون کے درمیان بحث ہوئی۔ پتہ چلا کہ کلید بردار ہمیں صرف صحن روضہ میں داخلے کی اجازت دے گا۔ اس نے اصل روضے کے اندر ہمارا داخلہ ممنوع قرار دیا تھا۔ گورنر نے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ یہ بری خبر سنانے سے قبل ہمیں دوپہر کا کھانا کھلائے۔

میری خطا

میں حضرت علیؑ کی ملامت کی درشتی کو محسوس کرتا ہوں "تم--- جس کے پاس میں خود ایک خواب میں آیا۔ تمہیں میرے ہاں آنے کیلئے گورنمنٹ کے پاس جا کر اجازت حاصل کرنا ضروری تھا؟"___ میں نے مایوسی کے عالم میں دوسروں کی طرف دیکھا جو، میری وجہ سے، پاک روضے میں داخلے کی عظیم سعادت سے محروم کئے جا رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، اپنے سفر کے اس غیر متوقع اور پریشان کن نتیجے پر بمشکل یقین کرتے ہوئے، ہم محافظوں کی معیت میں کاروں پر روضے کی طرف لے جائے گئے۔ ہمیں صحن میں بعجلت پھرایا گیا حتیٰ کہ ہم صدر دروازے کے سامنے جا ٹھہرے۔ یہاں زمین پر چت پڑے ہوئے ہزاروں عرب عورتوں اور بچوں کے درمیان میں نے کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ سابقہ زیارت کے موقعہ پر میرے اور ایک سید (خادم) کے علاوہ اس صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جلد ہی کچھ خدام ہمیں محافظوں میں گھرا ہوا دیکھ کر، روضے سے باہر نکل آئے۔

جب میں اپنے لئے دعائیں مانگ رہا تھا کچھ خدام عربی میں ایک دوسرے کے ساتھ میرے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ بعد میں ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں بتایا "تمہیں پتہ ہے وہ کہہ رہے تھے کہ امام علیؑ تمہارے دل میں ہے، انہوں نے پولیس والوں سے کہا "اسے اندر جانے دو، اسے اندر جانے دو--- ہم اس آدمی کو اندر لے جائیں گے" لیکن پولیس والے گورنمنٹ کی ہدایات سے

سرتابی نہیں کر سکے۔

اپنی دعائیں ختم کرنے کے بعد میں نے کڑکتی دھوپ میں' انتہائی مایوسی کے عالم میں' بغداد کی طرف تین گھنٹے کا واپسی سفر اختیار کیا۔

حضرت علیؑ نے مجھے شکست برداشت کرنا سکھایا تھا۔ ان کے بارے میں میرے یقین کامل نے' ان تمام سالوں میں مجھے سہارا دیئے رکھا۔ لیکن جب انہوں نے ہی مجھے دھتکار دیا تو میں کچھ تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھ سے کیا خطاء ہوئی تھی؟ اپنے ہوٹل میں' بستر پر لیٹ کر یہی سوچتے ہوئے میں سو گیا۔

بعد میں' شام کے وقت میرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ استقبالیہ والوں نے مجھے بتایا کہ گورنمنٹ کا ایک نمائندہ نیچے ہال میں مجھ سے ملنے کیلئے منتظر تھا۔ چونکہ مجھے جگایا گیا تھا اور ابھی بے حد تھکا ہوا تھا لہٰذا میں نے اسے اوپر بلوا لیا۔ وہ وہی عراقی افسر اطلاعات تھا جس نے 1968ء میں پہلی دفعہ نجف کی زیارت میں میری رہنمائی کی تھی۔ "آپ مجھے بھولے تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

البتہ وہ مجھے یاد تھا' میں نے اسے بتایا کہ میری نئی کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے گورنمنٹ کی طرف سے مجھے بمعہ خاندان کے نجف لے جانے کی ہدایات ملی تھیں۔ " گورنمنٹ نے مجھے خاص طور پر آپ کا خیال رکھنے پر مامور کیا ہے۔ میں خود آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

میں نے لمحہ بھر کیلئے سوچا۔ ملامت کے الفاظ پھر میرے ذہن میں ابھرتے ہیں "تم' جس کے پاس میں خواب میں آیا۔ تم میرے پاس گورنروں اور گورنمنٹ کے نام تعارفی خطوط لیکر آنا چاہتے ہو؟"

میں نے افسر اطلاعات کو بتایا کہ میں اس کے کہنے پر دوبارہ نجف نہیں جاؤں گا "مجھے احساس ہے کہ حضرت علیؑ نہیں چاہتے کہ میں وہاں جاؤں" "لیکن کیوں؟" اس مخلص انسان نے پوچھا "میں آپ کو لے جانے کیلئے تیار ہوں۔ میری گورنمنٹ آپ کو ہر طرح کی سہولت دینا چاہتی ہے"۔ "نہیں جناب" میں نے جواب دیا "یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے (آج) ان کے روضہ سے باہر کھڑا رکھا گیا۔ مجھے کبھی ایسا دکھ نہیں ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ مجھے خود یاد نہ فرمائیں' میں نہیں جاؤں گا"۔ یہ ایک تکلیف دہ فیصلہ تھا مگر میں نے کر لیا۔ یہ اس سال 4 ستمبر' سوموار کی شام کا واقعہ ہے۔

پورے ایک دن کے بعد پیغام ملا۔ یہ کیسے اور کس کے ذریعے ملا' ایسا معاملہ نہیں ہے کہ

اس پر ابھی کھلی بحث کی جائے۔ لیکن اس کے نتیجے میں' بدھ کی علی الصبح' ہم نے پھر اپنے آپ کو نجف کی طرف جانے والی اسی سیاہ سڑک پر مصروف سفر پایا۔ ہم سوا دو گھنٹوں میں نجف پہنچ گئے۔ دور روشنیاں چمکتی نظر آئیں اور افق پر حضرت علیؑ کے مزار کا گنبد پھر نمایاں ہونے لگا۔ سڑک خالی تھی حتیٰ کہ ہم اس چھوٹے قصبے میں پہنچ گئے کہ اچانک یہ سڑک بسوں اور کاروں سے اٹی نظر آئی اور لکھوکھا آدمی راستوں پر چلتے نظر پڑے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس روز اتنے لوگ نجف میں کیونکر جمع ہوئے تھے۔

پولیس نے ہماری گاڑی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا مگر اس راستے سے دوسری سمت جدھر ہم جانا چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اپنی جائے مقصود' جو کہ مزار مقدس ہی تھی' کے گردا گرد گھوم رہے تھے۔ بالآخر ہماری کار آگے نہ جا سکی۔ ہم نے اسے ایک بغلی گلی میں کھڑا کیا اور باہر نکل کھڑے ہوئے۔ ہم اب روضہ سے ایک چوتھائی میل دور تھے۔ فاصلے پر' اس کا بغلی دروازہ ہمیں نظر آ رہا تھا۔

اب ہم جس کوچے میں چل رہے تھے' اس جیسی صرف ایک اور گلی تھی' یہ وہ گلی تھی جس کا ذکر بائبل میں 'صراط مستقیم' کے نام سے ملتا ہے۔ میں' کئی سال پہلے' اس پر چلا تھا جبکہ میں لبنان کے شہر بیروت سے ایک روز کے تفریحی سفر پر شام میں واقع دمشق میں گیا تھا۔ جس طرح مجھے یہ احساس تھا کہ 'صراط مستقیم' نامی گلی میں مجھ سے پہلے حضرت عیسیٰؑ چلے پھرے تھے' اسی طرح مجھے محسوس ہوا کہ روضہ حضرت علیؑ کی طرف جاتی ہوئی نجف کی یہ گلی بھی ویسی ہی مقدس تھی۔

میری بائیں جانب میدان لوگوں سے پر تھا--- عورتیں' بچے اور بوڑھے مرد--- میری دائیں طرف آٹھ فٹ گہرا ایک گڑھا تھا۔ زمین ریتلی تھی' صحراؤں سے مخصوص' ویسی ہی جیسی کہ انبیاءؑ کے قدم رکھنے کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔ ایک احساس نزول--- جونہی میں اس تنگ راستے پر چلنے لگا۔ ایک کیف خوف و رجاء اور احترام مجھ پر طاری ہو گیا۔ اپنے بائیں طرف سیاہ لبادوں میں ملبوس لوگوں اور داہنی طرف گہری کھائی کے پاس سے گزرتا ہوا--- روشن و مجلا مزار کی طرف چلتا گیا۔

ہر قدم پر میں احتیاط سے دیکھتا گیا کہ میرا پیر کہاں پڑ رہا ہے تاکہ کسی کو لتاڑ نہ دوں۔ جوں ہی میں روضہ کے صحن کے دروازے پر پہنچا' میں نے رکنے کی کوشش کی لیکن لوگ مجھے صحن کے اندر' جو کہ بذات خود سڑک کی بہ نسبت زیادہ لوگوں سے بھرپور تھا' آگے دھکیلتے رہے۔ ایک انچ زمین بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے عقب میں سیاہ عباؤں میں لپٹی ہوئی عورتیں روضے ہی کی

طرف، آگے ہی آگے، اڑتی چلی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک طرف ہو کر اڑتے ہوئے مسلمانوں کے مجمع کو، جن میں زیادہ تر عرب تھے، راستہ دینے کی کوشش کی کیونکہ اگرچہ مجھے نجف بلایا گیا تھا، مجھے تاحال یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے روضے کے اندر جانے کی اجازت ہو گی۔ اگر ہو گی تو کون مجھے اندر لے جائے گا؟

اس طرف سے جہاں میں کھڑا ہوا تھا مجھے اجسام کے مدو جزر میں واپس پھینک دیا گیا جس نے بدلے میں مجھے اس ریلے میں دھکیل دیا۔ جو روضے ہی کی طرف رواں دواں تھا۔ اس عالم میں کہ یہ ادھر ادھر کی دھکم پیل جاری تھی، مجھے اپنی چھاتی میں اچانک کھچاؤ محسوس ہوا۔ ورید قلب میں جانا پہچانا ہوا درد، جو کہ پونا میں میرے ماہر قلب نے بتایا تھا کہ ختم ہو چکا، پھر سے پلٹ آیا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا گویا ورید قلب اور درد دونوں ہی دوبارہ زندہ ہو گئے تھے۔

یہ ایک شدید درد تھا۔ مجھے پہلو بہ پہلو تیز ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ بلاشبہ یہ عارضہ قلب تھا۔ میں اس کے قرائن سے بخوبی واقف تھا۔ میرے اندر قوت مدافعت ہی نہ رہی تھی۔ میرے اوپر غشی طاری ہونے لگی۔ اچانک مجھے احساس ہوا گویا مجھے کسی مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے پکڑ کر آگے دھکیلا اور فی الواقعہ صحن سے اٹھا کر روضے کے اندر پھینک دیا۔ میں نے ٹھوکر کھائی اور گھٹنوں کے بل گر پڑا، فرش پر پڑے ہوئے، میں نے چپلیں اتاریں اور قبل اس کے کہ یہ سوچتا کہ میں کدھر جاؤں مجھے نادیدہ ہاتھوں نے اٹھا لیا، مجھے کھڑا کیا، اور حقیقتاً" اٹھا کر مجھے روضے کے اندر پہنچا دیا۔ میرا جسم ایسا نہیں کہ آسانی کے ساتھ اٹھ جائے لیکن کسی نے ایسا کر دکھایا۔ میری آنکھیں، جو درد کی وجہ سے بند ہو چکی تھیں، کھل گئیں اور میرے ہاتھ ناطاقتی کے ساتھ پھیل گئے۔ معجزانہ طور پر، اسی لمحے میرا درد کافور ہو گیا اور ہتھیلیاں پھیلا کر کھڑے ہوئے میں نے بے اختیار یہ الفاظ ادا کئے "یا علیؑ میں حاضر ہوں۔"

پھر کسی نے مجھے مزید نہیں دھکیلا۔ میں آہستگی سے آگے بڑھتا گیا۔ میرے آگے راستہ کھل گیا تھا۔ جونہی میں نے نظر اٹھا کر گنبد کی طرف دیکھا، جو اپنے ہزاروں دمکتے آئینوں، جن میں ضریح کے ساتھ بندھے ہوئے لہراتے سبز ربنوں کے عکس جگ مگاتے ہیں، مجھے محسوس ہوا گویا میں ایک ایسے غار میں ہوں جس میں ہیرے اور زمرد ٹکے ہوئے ہوں۔ یہ ایک پرشکوہ نظارہ تھا۔

میں لوگوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا ان کی ضریح اقدس کے گرد طواف کیا۔ جانب سر سے گزرا جہاں ان کے روضے کے خدام کو کھڑے دیکھا۔ اس منظر پر جنت کے نظارے کا بخوبی گمان

ہوتا تھا۔

میں نے ایک سید (خدام کے سردار) کو جس کا چہرہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح تھا' اور جو حضرت علیؑ کی ضریح کی حفاظت پر مامور تھا' اپنی طرف سر نیہوڑاتے ہوئے دیکھا۔ کیا یہ ایک پراخلاص استقبال تھا؟ کیا وہ اس بات سے باخبر تھا کہ میں ہی وہ آدمی تھا جسے حضرت علیؑ نے خواب میں دیدار کرایا تھا؟ مگر جب ہم حضرت علیؑ کے روضے کے سرمئی سنگ مزار کا طواف کر رہے تھے' جہاں پر اس روز تقریباً پانچ لاکھ نفوس اظہار عقیدت کیلئے حاضر ہوئے تھے' تو یہ تمام باتیں معمولی معلوم ہوتی تھیں۔

شب معراج

"اس قدر لوگ کس لئے؟" جو آدمی ہمارے آگے چل رہا تھا اس نے میرے سوال کا جواب دیا "یہ شب معراج ہے' جب حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرش پر تشریف لے گئے تھے۔ تمہیں معلوم نہیں کیا؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ جب میں پہلی مرتبہ نجف پہنچا تو وہ حضرت علیؑ کا روز ولادت باسعادت تھا اور اب کی مرتبہ انہوں نے مجھے شب معراج کے خاص موقع پر نجف میں آنے کیلئے اذن باریابی مرحمت فرمایا تھا۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا اور ہم اپنی کار کی طرف لوٹ رہے تھے' میں نے اپنے قافلہ کی ایک لڑکی کو مسلسل ورد کرتے ہوئے سنا "یا علیؑ... یا علیؑ... یا علیؑ... ..."

"بیٹی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا "تم کچھ خائف معلوم ہوتی ہو' تم انہیں اتنی اونچی آواز میں کیوں پکار رہی ہو؟" میں حیران ہو رہا تھا کیونکہ ابھی تو ہم ان کے روضہ اقدس سے ہو کر' اسے چھوکر' اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے آ رہے تھے۔

اس لڑکی نے زور سے میرے ہاتھ کو پکڑ لیا اور پوچھا "کیا آپ ٹھیک ہیں؟ مجھے خدشہ تھا کہ ہم آپ کو کھو بیٹھیں گے کیونکہ آپ اس قدر بیمار لگ رہے تھے" "ہاں مجھے ذرا درد ہوا تھا" میں نے جواب دیا "لیکن اب وہ بالکل جاتا رہا ہے" "اللہ کی مہربانی ہے" اس نے کہا "لیکن جب میں نے آپ کا چہرہ دیکھا اس کا رنگ راکھ جیسا تھا۔ آپ بمشکل چل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا 'وہ' آپ کو اس لمحے اپنے ہمراہ لے جا رہے تھے---"

"میری یا ہم میں سے کسی کی فکر مت کرو" میں نے اسے سمجھایا "آج میں نے انہیں (حضرت علیؑ کو) اپنے بہت قریب پایا ہے۔ وہ ضرور ہمیں لینے کیلئے موجود تھے۔"

اسی لمحے میرے کانوں میں، صاف طور پر یہ الفاظ گونجے "گورنمنٹ... گورنمنٹ... تمہیں کس نے اندر پہنچایا؟... گورنمنٹ نے یا میں نے؟" ایک رعب دار مردانہ آواز میں، جو ایک اور شخص نے حقیقتاً ادا کئے، بلاشبہ وہ حضرت علیؑ ہی مجھ سے مخاطب تھے۔ میرے تمام بدن میں سنسنی پھیل گئی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس فہمائش میں کئی معنی پنہاں تھے۔ اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ وہ کوفت یا دھبہ دور ہو جو میری اپنی گورنمنٹ نے پچھلے سال مجھے نظر بند کر کے لگانے کی سعی کی تھی۔ ان کے 1949ء کے الفاظ "ہمت پکڑ، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں" اب ایک حقیقت بن چکے تھے۔ یہی نئی "خود ستائی" یا "تعلی" تھی جس کا میں مضمون کے شروع میں ذکر کر چکا ہوں۔

میں نے اظہار شکرانہ کے طور پر، خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔ میں بات کی تہ کو پہنچ چکا تھا۔

نجف اب بھی محض ایک مدفن ہے، یہ امر کہ حضرت علیؑ کے ماننے والوں نے روضہ کے قبہ کو سونے کی اینٹوں اور مزار کو چاندی کی ضریح سے سجایا، سنوارا ہے میرے لئے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ نجف اشرف ایک منبع ایقان ہے۔ ایمان ایک ناقابل فہم اور ناقابل تشریح بات ہے۔ کوئی بھی اسے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ گون آباد، ایران کے ایک بڑے عالم نے اپنے ایک فارسی خط میں مجھے لکھا تھا "حضرت علیؑ کو سمجھنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے"___ .... "میرا کوزہ بھر رہا ہے"___

پہلا باب

خوشبو کی پہلی لپٹ

جون 1947ء میں، میں دلی جانے والا تھا۔ انہی دنوں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن دو خود مختار مملکتوں، ہند اور پاکستان میں تقسیم کا اعلان کر چکے تھے۔ آزادی کی آمد آمد تھی۔ دلی سیاسی گہماگہمی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ جناح وہیں تھے اور اپنی کامرانی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ انہوں نے برطانیہ سے اپنی بات منوا لی تھی کہ ہندوستان کا اس طرح بٹوارہ کیا

جائے کہ ملک کا ایک حصہ مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن قرار پائے۔ جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل پر مشتمل ہندوستانی ٹیم کام چلانے کیلئے مستعد ہو رہی تھی۔

میں بذریعہ ریل، فرنٹیئر میل دلی گیا۔ ریلوے سٹیشن جاتے ہوئے میں اپنے والدین کے ہاں ملنے گیا۔ جیسا کہ ہمارے خاندان میں رواج تھا۔ میں نے ان کے چرن چھوئے۔ ماں نے مجھے گلاب کی کلیوں کے ہار پہنائے۔ میں نے ہار اتارے اور ان کی پوجا کی چوکی پر رکھ دیئے۔ جہاں زرتشت کی ایک صندلین منقوش مورت رکھی تھی۔ مہاتما بدھ کا چینی مٹی کا مسکراتا ہوا ایک بت پڑا تھا، ایک صلیب جس پر حضرت مسیحؑ کو مصلوب دکھایا گیا تھا۔ عفت مآب (حضرت) مریمؑ کی ایک شبیہہ، ہندوؤں کی دولت کی دیوی لکشمی، ہاتھی کی سونڈ کے چہرے والا دیوتا گنیش اور مسلمان اولیاء کرام اور مقدس مقامات کی تصاویر جن پر عربی عبارت درج تھی۔ میری ماں کے طریق مذہب کی رو سے، جو ظاہری ہیئت میں بے تعصب، تاہم یقین میں راسخ تھا۔ میں ان دنوں ملحد گردانا جاتا تھا۔ پھر بھی، انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ دوسرے کیا کرتے تھے۔ اگر آپ نے کونے میں رکھی ہوئی چوکی پر کھڑے ہو کر، کچھ دعا مانگنے کی ضرورت محسوس کی تو آپ کو اس کی کھلی اجازت تھی۔ اگر نہیں تو انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

اس سہ پہر دو چھوٹے لفافے ان کے ہاتھ میں تھے۔ ایک میں حسب معمول گیارہ روپے تھے، ایک دس روپے کا کرنسی نوٹ اور ایک چاندی کا روپیہ۔ یہ مجھے سفر پر روانگی کے وقت نیک فال کے طور پر دیا گیا تھا۔ دوسرے لفافے کو لئے ہوئے انہوں نے توقف کیا اور کہا "کیا تم دلی میں میرا ایک کام کر دو گے؟"

"کیوں نہیں!" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"لیکن یہ بالکل ویسا کام نہیں جو بالعموم تم کیا کرتے ہو۔۔۔"

"اگر یہ آپ کی خاطر ہے تو میں سبھی کچھ کروں گا، ہر کہیں جاؤں گا۔ کوئی سی چیز پہنچاؤں گا"۔

"اچھا دیکھو" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا "چند برس پہلے جب میں دلی میں تھی۔ میں نے ایک درگاہ پر حاضری دی۔ یہ (حضرت) نظام الدین اولیاء کا مقبرہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ لفافہ وہاں پہنچاؤ۔ کوئی بھی ٹیکسی ڈرائیور تمہیں وہاں لے جائے گا"۔ انہوں نے ان کا نام دہرایا اور بتایا کہ انہوں نے لفافے پر نام لکھ دیا تھا تاکہ میں بھول نہ جاؤں۔۔۔

"جب تم وہاں جاؤ تو وہاں کے سرکردہ آدمی کا پتہ پوچھنا جو درگاہ کی خدمت کرتا ہے۔ وہ مجاور کہلاتا ہے اس نے مجھے ایک خط لکھ کر کے اطلاع دی ہے کہ عرس کا وقت نزدیک آ رہا ہے"۔

'عرس' جیسا کہ اسے بولا گیا تھا۔۔۔ مجاور۔۔۔ درگاہ۔۔۔ یہ تمام الفاظ ایک ایسی زبان کے الفاظ

تھے جو میرے لئے انوکھی تھی۔ میں نے ان کی ہدایات کو بغور سنا۔ "عرس" انہوں نے بتایا "اس ولی کی برسی کو کہتے ہیں جو وہاں پر مدفون ہیں۔ وہ اسے ہر سال غربا کو کھانا کھلا کر مناتے ہیں۔ بہرحال‘ اسے مجاور کو دینا۔ اس میں بس اکیس روپے ہیں جو میں فی الوقت دے سکتی ہوں۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے کہنے کے مطابق کروں گا۔

"اور اگر تم اپنے لئے کوئی دعا کرو" انہوں نے مزید کہا "تو کسی وقت وہ پوری ہو جاتی ہے"

میں نے سر خم کر کے 'ہاں' کہی کہ ان کی نصیحت پلے باندھ لی ہے اگرچہ میں 'روحانی طاقتوں' یا مافوق الفطرت قوتوں کا قائل نہیں تھا۔

آکسفورد میں تعلیم پانے کی وجہ سے' میرے نزدیک ان دنوں زندگی گزارنے کے چار طریقے تھے.... حریت پسندی جسے میں اچھا سمجھتا تھا مگر یہ ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی' قدامت پسندی' جو ہندوستان اور اس کی آزادی کے تعلق سے لکیر کا فقیر ہونے کے مترادف تھی۔ کوئی ازم'--- فرمانرواؤں سے بھرپور' جو حکومتوں پر قابض رہتے ہیں۔ اشتراکیت جو آکسفورڈ گروپ مومنٹ کی طرح' منفی لیکن ناممکن الوقوع تھا--- اور اشتمالیت' جو جلد یا بدیر انقلابات کی تلقین کرتی تھی۔ تاہم انہیں (والدہ کو) خوش کرنے کیلئے میں کہیں بھی اپنا سر جھکا لیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی میرے مسلک کا ملخص ولیم ارنسٹ ہینلے کی ایک نظم کے الفاظ یوں تھے

"حقیقت حال کے کٹھور چنگل میں
میں نہ پیچھے ہٹا نہ چلایا!
قسمت کی مار سہ کر گو
میرا سر لہو لہان ہے مگر جھکا تو نہیں"

میں جس سورما کا متلاشی تھا' وہ ایک ایسا انسان تھا جو صاف ذہن' ایک منطقی ادراک اور پیدائشی طور پر انصاف کے بنیادی اصولوں کا شعوری جذبہ رکھتا ہو۔ ایسا انسان جو جمہوریت میں راسخ العقیدہ ہو' جو قانون کی حکومت کا حامی ہو۔ ایسا شخص جو اس جوہر مساوات' جو لنکن کی گیٹس برگ کی تقریر میں تھا' کے مطابق سوچ اور محسوس کر کے عمل پیرا ہو سکے۔ سب سے بڑھ کر میرے ہیرو کے پاس اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ڈھنگ آنا ضروری تھا۔ ان دنوں میرے نزدیک کامل قوت گویائی موسیقی تھی جیسا کہ بیتھوئن' موزارت اور باخ.......

لیکن اپنی ماں کی خاطر میں نے اس مقبرے پر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اگرچہ سیڑھیاں اترتے اترتے میں اس کا نام بھول چکا تھا۔ لیکن مجھے علم تھا کہ لفافے پر پوری تفصیلات اور ہدایات درج تھیں کہ کس طرح وہاں جانا چاہیے۔ میں بعجلت سینٹرل سٹیشن کی طرف چلا تاکہ

فرنٹیر میل پکڑ سکوں۔

دلی میں باقی کاموں سے فارغ ہو چکا تھا اور اب واپس بمبئی جانے کا وقت آگیا تھا۔ صرف ایک کام باقی رہ گیا تھا۔ لفافے کی مقبرہ تک سپردگی۔۔۔ مجھے ابھی اسے دلی میں تلاش کرنا تھا۔ "کوئی بھی ٹیکسی والا تمہیں وہاں پہنچا دے گا" ماں نے بتایا تھا۔

امپیریل ہوٹل کے باہر، جہاں میرا قیام تھا، میں نے ایک ٹیکسی لی، سورج غروب ہونے میں کافی وقت تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے پر لکھا نام پڑھ کر میں نے سکھ ڈرائیور کو بتایا۔ نظام الدین اولیاء ___ "کیا تم جانتے ہو یہ کہاں واقع ہے؟"

اس نے پوچھا کہ آیا میں نظام الدین، دلی کے علاقے میں جانا چاہتا تھا یا درگاہ پر؟ "درگاہ پر" میں نے جواب دیا۔

اس نے یقینی انداز میں سر خم کیا، انجن کی رفتار تیز کی اور ہوٹل کے گیٹ سے باہر آگیا۔

وہ خاموش رہا حتیٰ کہ ہم کھلی سڑک پر پہنچ گئے، پھر پوچھا "آپ مسلمان ہیں؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔

"آپ ہندو بھی نہیں ہو سکتے" اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اس قوم سے بھی نہیں تھا۔

"نہ ہی مسلمان، نہ ہی ہندو" ___ اس نے تعجب سے ایسے کہا گویا ہندوستان میں اور کوئی قوم ہی نہیں بستی تھی۔ یہ غالباً" اس لئے تھا کہ تمام سیاسی مذاکرات، کئی مہینوں تک ہندی ہندوستان اور مسلم پاکستان کے گرد محدود رہے تھے۔

میں نے یہ کہہ کر اس کی مشکل آسان کر دی "جس طرح تم ایک سکھ ہو کر ہندوستانی ہو اسی طرح میں ایک پارسی ہو کر ہندوستانی ہوں، سمجھے؟"

اس نے کئی بار سر ہلایا گویا کہ میری توجیہ اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے پارسیوں کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ بمبئی میں رہتے تھے، جس پر میں نے صاد کیا۔ اس نے مزید اطلاع بہم پہنچائی کہ ان میں سے اکثر بہت دولت مند تھے۔ یہ کہہ کر اپنی بات کی حیثیت بڑھائی "ہم نے ایسا ہی سنا ہے" ___ "ہم ہمیشہ اور اب بھی اس بات کے مترادف ہے "ہم دلی والے" یعنی ہم فرمانرایان ہندوستان۔۔۔ مغل اپنے وقتوں میں اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ پھر انگریزوں نے ایسا کیا۔ اور اب، آزادی کے بعد ہم دلی والے اس شاہانہ "ہم" کا استعمال جاری رکھیں گے۔ اس کی بات کا یہی مفہوم تھا۔

مونٹ بیٹن کے عین قریب اس سرخ اینٹوں کی عمارت کو چھوڑتے ہی "ہم" جلد ہی وائسرائے ہاؤس میں ہوں گے۔ ہاں دوست، تم اور میں یہ شمال میں رہنے والے عام آدمی کے

محسوسات ہو سکتے تھے لیکن یہ اب تک ہندوستان کے باقی حصے میں سرایت نہیں کر سکتے تھے۔ نہ کبھی کر سکے۔

نظام الدینؒ کے مقبرے تک سفر طویل معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے سکھ ٹیکسی ڈرائیور سے گفتگو چھیڑ دی۔ جیسا کہ جانتا تھا کہ میں مسلمان نہیں تھا۔ پھر میں ایک اسلامی مقبرے کی طرف کیوں جا رہا تھا؟

"ہر شخص اس درگاہ پر جاتا ہے" اس نے بتایا "ہندو' مسلمان' سکھ۔ لوگ کہتے ہیں اس سے بہت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ لیڈی ولنگڈن بھی وہاں گئی تھی"۔ لیڈی ولنگڈن ایک سابقہ وائسرائے کی بیوی تھی۔ یقیناً وہ نہیں گئی ہو گی۔ جب میں نے اپنے شبہات کا اظہار کیا تو اس نے مجھے کہا کہ میں درگاہ پر اس کی تصدیق کروں "وہ یقیناً اس کے متعلق جانتے ہوں گے" اس نے مزید کہا ہم ایک طویل شاہراہ پر سفر کرتے رہے اور اچانک سیدھے ہاتھ کی طرف چھوٹے راستے پر ایک بڑے خاکستری مغلیہ طرز کے مزار کے پاس سے گزرتے ہوئے مڑ گئے۔ میں نے معلوم کیا' کہ کیا یہی وہ مقبرہ تھا جہاں ہمیں جانا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر میری بات کی اصلاح کی۔ "یہ محض ایک شہنشاہ کی قبر ہے۔ شہنشاہ جونہی مرتے ہیں کچھ نہیں کر پاتے" اس نے وضاحت کی "صرف اولیاء ہی یہ طاقت رکھتے ہیں"۔

ہم ایک چھوٹی سی کھلی جگہ پر جا پہنچے جہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی دکانوں پر گلاب کی پتیاں' ہار' اگربتیوں کے پیکٹ اور چھوٹی سفید شیرینی بکنے کے لئے رکھی تھیں۔ سینکڑوں مکھیاں ان کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ سرخ ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے دکاندار مسلمان تھے۔ چند ایک نے نہایت میلی سفید پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں جو دھول پڑنے کی وجہ سے بھوری لگ رہی تھیں۔ میری گاہکی کے لئے ہنگامہ برپا ہوا اور ایک ساتھ آوازیں آئیں "صاحب' صاحب" ہر شخص کی خواہش تھی کہ میں اس کے ہاں سے سودا لوں۔ میں نے ایک دکان سے ایک ہار خریدا "ایک نہیں" دکاندار نے کہا "آپ دو خریدیں" "دو کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

اس شخص نے وضاحت نہیں کی لیکن میرے گرد کھڑے ہر شخص نے بتایا کہ مجھے دو خریدنے چاہئیں۔ لہٰذا میں نے مزید سوال کئے بغیر' ایسا ہی کیا۔ پھر مجھے ہدایت کی گئی کہ میں دو طباق بھر گلاب کی پتیاں اور دو اگربتیوں کے پیکٹ خریدوں۔

صدر دروازے سے گزرنے سے پہلے مجھے جوتے اتارنے اور وہاں رکھے ہوئے سینکڑوں دوسرے جوڑوں کے ساتھ چھوڑنے پڑے۔ پھر چند سیڑھیاں اترنی پڑیں جن پر سے ایک مربع شکل کا بڑا گہرا' کھلا تالاب نظر پڑا جس کا پانی خاص طور پر شفاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا یہ غیر صحت مند پانی کئی امراض کے لئے اکسیر تھا اگرچہ کوئی سائنسی ذہن رکھنے والا آدمی

اس پر بمشکل ہی یقین کرتا۔

ایک نوجوان میرا راہبر بن گیا اور ہم بائیں جانب ایک تنگ مسقف راستے کی طرف مڑ گئے جو پرانے پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے دو رویہ بڑے ضعیف گداگر بیٹھے ہوئے تھے۔ زن و مرد' جو ایک ہم آہنگی کے ساتھ خیرات مانگ رہے تھے۔ ایک مقدس مزار کے اندر یہ ایک دل سوز منظر تھا۔ غلام گردش کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک گونجتی ہوئی بھکاریوں کی آہ و زاری کو سننا تکلیف دہ تھا۔ میں یہاں پر صرف اپنی ماں کی خاطر موجود تھا۔ میرے خیال میں' میرا دوبارہ وہاں جانا نہ ہو گا۔ مجھے بھکاریوں سے بیماریاں لگ جانے کا خیال آیا جن کے قریب سے میں ننگے پاؤں گذر رہا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہوٹل واپس پہنچتے ہی ایک جراثیم کش غسل کروں گا۔ مزارات اور درگاہیں میرے ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہیں تھیں۔ ایک بار کا آنا کافی تھا۔

غلام گردش کے اختتام پر ہم بائیں طرف مڑ گئے۔ ہم ایک بڑے فرش بند دالان میں جا نکلے جس کے وسط میں سنگ مرمر کی آراستہ و پیراستہ' ایک چھتری نما عمارت تھی۔ اس کے اندر مزار تھا۔ جیسا کہ میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس لڑکے نے جو میری نگہداشت کر رہا تھا مجھے اور آگے چلے جانے کو کہا۔

"تو کیا یہ مزار نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

نوجوان مجھے جو کچھ بتانا چاہتا تھا نہ بتا پایا۔ اسی دوران میں کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے' ایک بزرگ آدمی ہماری پشت پر آگیا۔ مسلمانوں کے طریقہ آداب' ـــــ یعنی سیدھے ہاتھ کو باوقار انداز میں اٹھا کر سلام کرتے ہوئے اس نے مجھ سے معلوم کیا' کیا آپ پہلے یہاں نہیں آئے؟"

میں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے کہا "میرے پیچھے آیئے" میں نے جس طرح کہا گیا تھا' کیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ درگاہ کا متولی تھا۔ مجاور' ـــــ وہی آدمی جس کو ملنے کیلئے میری ماں نے مجھے تاکید کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے ذرا آگے ایک اور مزار پر لے جا رہا تھا۔

"یہ" اس نے وہاں پہنچنے پر وضاحت کی "امیر خسروؒ کا مزار ہے۔ وہ مغلوں کے درباری شاعری تھے"۔ مجاور نے اس شہنشاہ کا نام لیا جس کے زمانہ حکومت میں شاعر رہ چکا تھا۔ "پھر جب نظام الدینؒ صاحب' اس جگہ اسلام کی تبلیغ کیلئے آئے' امیر خسروؒ نے شاہی دربار چھوڑ دیا تاکہ ولی اللہ کی خدمت کر سکیں۔ وقت آنے پر وہ نظام الدینؒ کے مرید ہو گئے اور اپنی بقیہ زندگی ان کی خدمت کیلئے وقف کر دی۔ وہ گویا ان کے اے۔ ڈی کانگ (مصاحب) بن گئے۔" چونکہ ولی

میں--- وائسرائے ہند کی وجہ سے ہر شخص جانتا تھا کہ ایڈی کانگ کیا ہوتا ہے' مجھے اس تعلق کو سمجھانے کا یہ ایک بہترین طریقہ تھا۔

"امیر خسروؒ صاحب بھی اپنے طور پر حضرت' (یعنی پیر) ہیں" مجاور نے کہا۔ "طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص امیر خسروؒ سے اجازت حاصل کئے بغیر حضرت نظام الدینؒ کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جب ان دونوں کا انتقال ہو گیا تو انہیں پہلو بہ پہلو دفن کیا گیا اور قدیم دستور تاحال جاری تھا کہ پہلے (حضرت) امیر خسروؒ کے ہاں سلام کریں پھر ایک عبادت کریں اور درگاہ شریف جا کر مراد مانگیں۔ حضرت نظام الدینؒ اولیاء کا مزار درگاہ شریف' کہلاتا تھا۔

میں نے طریقے پر صحیح طور پر عمل کیا۔ پہلے امیر خسروؒ کے مزار پر گیا' جو سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ جس پر نارنجی رنگ کے سنہری کام سے مزین غلاف پڑا ہوا تھا۔ اس چادر کے اوپر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مزار کے سرہانے پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہار چڑھایا اور جس طرح مجھ سے پہلے لوگوں نے کیا تھا' کچھ گلاب کی پتیاں نچھاور کیں۔ مجاور نے اگر بتیوں کا پیکٹ کھول کر ساری اگر بتیاں مجھے تھما دیں تاکہ میں انہیں سلگاؤں۔

"ان میں سے کتنی جلاؤں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جتنی چاہو' اگر خواہش ہو تو تم ساری سلگا سکتے ہو"۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک تیلی کے ساتھ میں نے سب کو روشن کیا۔ اگر بتیوں کے روشن الاؤ میں سے چنبیلی کی معطر مہک کی بھاری بو باس نکلی۔ میں انہیں ہاتھوں میں تھامے رہا اور خاموشی سے دعا مانگی۔ "میری والدہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں صرف ایک پیامبر ہوں۔ براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ میں حضرت نظام الدینؒ کے مزار پر تعظیم بجا لاؤں"۔ میں نے موقع محل کے لحاظ سے چند اور الفاظ کہے ہوں گے۔

یہاں پر کس قدر سکون تھا

مقبرہ کے دروازے کے نزدیک ایک برقعہ پوش عورت جھکی ہوئی مصروف عبادت تھی۔ اس کا چہرہ سر اور جسم ڈھکے ہوئے تھے لیکن اس کے نازک پیروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان تھی۔ اس کی سنہری چوڑیاں اور کپڑے یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس کا تعلق بالائی متوسط طبقے سے تھا۔ مقبرے کے قدمچے اور پہلوؤں میں مرد' خاموشی سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایسا نظارہ جو جاذب نظر تھا۔ وہ اس قدر خلوص سے دعائیں کر رہے تھے جو کشش انگیز تھا۔ لیکن میرے لئے ایسے منظر کو قبول کرنا مشکل تھا کیونکہ میرے ایسا منطقی ذہن و دماغ ایسی مذہبی رسوم کو اوہام پرستی پر محمول کرتا تھا۔ مجھے اپنے آپ میں کچھ محسوس تو نہیں ہوا لیکن میرے لئے کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ میں اپنے گرد و پیش دوسروں کو اس مقبرے کے سامنے مکمل طور پر تقدس آمیز

سپردگی کے عالم میں مشاہدہ کروں۔ تاہم یہ تو اس اصل مقبرے کی صرف نصف منزل راہ تھی جس کو دیکھنا ابھی میرے لئے باقی تھا۔

حسب دستور اجازت مانگی گئی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ اجازت مل چکی' میں نے گلاب کی پتیوں' ہار اور اگربتیوں کا دوسرا بنڈل لئے ہوئے حضرت نظام الدینؒ کے مقبرے کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے اس دوسرے مزین مقبرے میں داخل ہوتے ہوئے قدرے زیادہ سہولت محسوس کی۔ غالبا" یاسمین کی پتیوں کی مہک کا تسکین بخش اثر ہو چلا تھا یا پھر یہ شام کے مدہم دھندلکے کی وجہ سے تھا کیونکہ سورج غروب ہو چکا تھا' کہ جس نے مجھ پر سرور انگیز کیف طاری کر دیا۔ شاید اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی کہ دالان کے وسط میں تین آدمی مدھم سروں میں غزل الاپ رہے تھے۔ وہ نظام الدینؒ کے مزار کے سامنے گا رہے تھے۔ درمیانی آدمی مصرع اولیٰ گاتا دور باقی دونوں کورس میں اس کی ہمنوائی کر رہے تھے۔

ایک مقدس مزار پر گانا؟ میں پہلے اسے نہیں سمجھ سکا۔ مجاور نے وضاحت کی کہ یہ متبرک گیت اس جگہ مدفون بزرگ سے "طلب فیضان کے لئے تھے"۔ ہر جمعرات اور جمعہ کو یہ آدمی' جو تین آدمیوں کا سرخیل ہے' "نظام الدینؒ صاحب' کی ثناء خوانی کے لئے شہر سے آتا ہے جو مقدس بزرگ کے ساتھ محض عقیدت کی وجہ سے کئی سال سے ایسا کرتا چلا آرہا ہے"۔

میں نے نظام الدینؒ کے مزار پر بھی دستور کے مطابق' وہی گلاب کی پتیاں نچھاور کرنے ہار چڑھانے اور بتیاں جلانے کی رسوم ادا کیں جیسا کہ میں امیر خسرو کے ہاں کر چکا تھا۔ پھر' قدرے بہتر طور پر توجہ مجتمع کر لینے پر اور یہ احساس کرتے ہوئے کہ جو فرض مجھے سپرد کیا گیا تھا وہ مکمل ہونے والا ہے' میں نے ان کے مزار کے سامنے اپنے لئے مختصر دعا مانگی۔ مجھے ماں کی بات یاد تھی "اپنے لئے بھی کچھ مانگ لینا ____ بعض اوقات جو کچھ تم مانگتے ہو مل جایا کرتا ہے" ____

اگر میں نے اپنے لئے کچھ مانگ لیا تو میرا کیا جائے گا۔ کچھ نہیں ابجز میرے وقت سے ایک یا دو ساعت کے' چنانچہ' اپنی والدہ کا پیغام پہچانے کے بعد میں نے سوچا کہ اپنے لئے کیا مانگا جائے۔ اس وقت مجھے دو باتوں سے رغبت تھی کیونکہ میں بے فکر نوجوان آدمی تھا جس پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ نہ بیوی کا نہ بچوں کا۔ ایک تو آزاد رہ کر عیش کرنے کی دوسرا گھوڑ دوڑ میں جیتنے کی۔ گھوڑ دوڑ میں جیتنا بڑا ہیجان انگیز تھا اور اپنے شرط لگائے ہوئے گھوڑے کا ایک جھنڈ کو دبا کر' جیتنے کی حد سے پچاس گز پہلے' گردن بڑا کر نکلتے ہوئے دیکھنا اور جیوری کا فیصلہ سننا نہایت زندہ دلی بخشنے والا ہوتا تھا۔ اس ولولے کو میں نے ہمیشہ دنیا کے تمام جوش سے بڑھ کر معیاری گردانا ہے۔ اس امر سے آگاہ ہوتے ہوئے کہ کسی مقدس جگہ پر غیر شائستہ اور بے ادب نہیں ہونا چاہیے میں نے اپنی عرضداشت کو کچھ اس طرح پیش کیا"۔

جس مقصد کے لئے میں حاضر ہوا تھا' میں نے مکمل کر لیا ہے۔ میری ماں کی ہدایت تھی کہ میں اپنے لیئے بھی دعا کر سکتا ہوں اور ممکن ہے کہ اگر آپ توجہ کریں تو کبھی میری مدد بھی فرمائیں گے۔ بدقسمتی سے جس نوعیت کی چیزیں میں اپنے لئے چاہتا ہوں وہ ناپاک ہیں' عیش حیات' گھڑ دوڑ میں جیتی گئی رقم' نشاط زندگی' وجیہ عورتیں۔ میں آپ سے۔ ان کی' اگرچہ یہ میری ضروریات زندگی ہیں۔ آپ سے خواہش نہیں کرسکتا جو ایک عظیم اور پاک روح ہیں۔ آپ مجھے جو کچھ عطا کرنا پسند کریں گے میں بخوشی لے لوں گا اور جو کچھ مجھے ملیگا میں اسکے لیئے آپ کا مشکور رہونگا۔ اگر میں گرفتار بلا ہو جاؤں تو میری مدد کریں' بس ___ ان الفاظ کے ادا کرتے ہی میں باہر چلا آیا۔ باہر کی فضا پوری طرح پر سکون تھی۔ صاف نیلگوں آسمان میں اولین ستارے جھلملانے لگے تھے۔ میں نے وہ رومال اتار لیا جس سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور مجاور سے کچھ باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا "میری والدہ نے آپکو دینے کیلیئے ایک چھوٹا سا لفافہ دیا ہے"۔ یہ سنتے ہی ایک نوجون خدمت گارنے' جو اسکے ساتھ چل رہا تھا' ایک کتاب نکالی جس میں چندہ کے اندر اجات کیئے جاتے ہیں۔ اس میں ایک خانہ میں عطیہ دینے والے کا نام درج کرنا ہوتا تھا اور اسکے بعد تین خانوں میں عطیہ کا جواز لکھنا پڑتا تھا یعنی غربا کے لنگر کیلیئے' مزار کی دیکھ ریکھ کیلیئے وغیرہ۔ چونکہ مجھے والدہ نے اکیس روپے دیئے تھے میں نے رقم کے تین حصے کیئے اور ہر خانے میں سات سات روپے لکھ دیئے۔ جونہی میں نے اپنی والدہ کا نام درج کیا اس نے جان لیا کہ میں ان کا بیٹا تھا"۔

مجاور سے باتیں کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہاں گردوپیش چند ہی قبریں تھیں۔ ایک بالکل ہی ننھی سی تھی جس پر صرف مٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کس کی قبر تھی۔

"یہ شاہ جہاں کی دختر جہاں آراء کی قبر ہے وہ اسکی دیگر اولادوں سے مختلف تھی اور اس نے وصیت کی تھی کہ جب اسکی وفات ہو تو اسے نظام الدین کے قرب وجوار میں دفن کیاجائے"۔

اسکی وصیت پوری کی گئی۔ اسکی قبر کے پہلو میں یہ تحریر درج تھی۔ "میری خواہش ہے کہ جہاں میں دفن ہوں صرف خاک مجھے ڈھانپ لے اور اس پر سبزہ اگے"۔

میں دروازے کی طرف لوٹا۔ اپنے جوتوں کی نشاندھی کی اور انہیں اپنے بے حد خاک آلود پیروں میں پہن لیا۔ سکھ ڈرائیور واپس مجھے ہوٹل پہنچاگیا۔

راستے میں اس نے کہا "آج آپ نے پہلی مرتبہ مہک پائی ہے۔ اب آپ انتظار کریں۔ اگر آپکی خواہشات پوری ہوگئیں تو آپ بار بار یہاں آئیں گے"۔

مہک تیز' بے حد معطر اور مشرقی تھی۔

نادر قسمت

آنے والے مہینوں میں میری قسمت کا نقشہ' حیرت انگیز کن وقفوں سے تسلسل کے ساتھ زبوں حال ہوتا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب میں نے اپنے نئے فلیٹ کے لئے فرنیچر کا آرڈر دیا۔ ساڑھے سات ہزار روپے پندرہ برابر قسطوں میں واجب الادا تھا۔ فرنیچر تیار کرنے والے اطلوی نے مجھے ایک کشش انگیز پیش کش کی۔ اس نے کہا کہ اگر میں دو ہفتوں کے اندر رقم ادا کر دوں تو وہ پانچ ہزار قبول کر لے گا۔ میں نے رقم ایک پرائیویٹ بینک سے ادھار لی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد بینک بند ہو گیا اور اس کے معاملات ایک سرکاری کارندے کے سپرد کیئے گئے جو عدالت نے مقرر کیا تھا۔ مجھے فوراً ادائیگی قرض کی ہدایت ملی۔ اس مقصد کے لئے مجھے ایک سود خور پٹھان سے رقم قرض لینا پڑی۔ اس رنگ ساز شخصیت سے لین دین مہنگا پڑا۔ اس کی شرح سود دس فیصد ماہوار تھی! میرے قرض کی ادائیگی تک میں فرنیچر کے پندرہ ہزار ادا کر چکا تھا اس رقم سے دگنی جو میں اطالوی کو سہولت کے ساتھ ادا کرتا۔

میری قسمت جوئے میں بھی کچھ بھلی نہ تھی۔ گھوڑ دوڑ میں کئی ہفتوں تک میں نے جیتنے کی خاطر گھوڑوں پر شرطیں لگائیں جو ہمیشہ دوسرے نمبر پر آتے رہے۔ ان میں سے بارہ سر بھر کے فاصلے سے ہارتے رہے۔ بالآخر جب میں نے ایک جیتنے والے گھوڑے پر ایک کے بدلے چھ کے ایسے پر منفعت طاق نمبر پر شرط لگائی تو سرخ مخروط مسند پر ___ اعتراض کی نشانی کے طور پر بلند کی گئی۔ مجھے خدشہ لاحق ہو گیا کہ میری رقم یقینی طور پر ڈوب گئی تھی۔ چنانچہ اعتراض برقرار رکھا گیا۔

انہی دنوں جب پوکر (تاش کا کھیل) کی بازی میں' جو ساری رات جاری رہتی تھی' علی الصبح آخری بار پتے بانٹے گئے تو میں نے ایک ہاتھ میں سارے بادشاہوں کا گھر پورا کر لیا مگر ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ایک یونانی نے بھی ایک ہی ہاتھ میں اکا حاصل کر کے مجھے ہرا دیا۔ "ٹھاٹھ دار قسمت" یونانی نے میز کے وسط میں پرزوں کے ڈھیر کو سمیٹتے ہوئے نعرہ مارا ___ ٹھاٹھ دار تو تھی۔ 1946ء تا 1949ء تمامتر' جبکہ میری جیب میں آنے والی سونے کی گنی تانبے کی دمڑی

میں ڈھل جاتی تھی۔ دوگناہ یا برابر ہونا تو کبھی میرے مقدر میں نہ تھا۔

اگر ایسے موقع پر کہ میں نے اپنے آپ کو غیر ضروری ناموافق حالات میں گھرا پایا تو ایسے اتفاقات بھی میسر آئے کہ میری چارہ سازی عجیب ترین صورتوں میں کی گئی۔

ایسے ہی ایک موقع پر، مجھے دو فوری ادائیگیاں کرنے کے لئے پانچ ہزار نو سو روپے درکار تھے۔ اول ایک پرخطر سود خور بنئے کو دوسری ایک ویسے ہی بدطینت انکم ٹیکس آفیسر کا تقاضائے ٹیکس، دونوں نے مجھے کھلی تنبیہہ کر دی تھی کہ اگر دسمبر کے آخری پیر تک ادائیگی نہ ہوئی تو وہ میرے خلاف عدالتی کارروائی کریں گے۔

صرف کوئی جنونی یا ایک خود کشی کرنے والا ہی اس سے ماقبل ہفتہ کے اختتام پر گھوڑ دوڑ میں جوا بازی کرنے کی جسارت کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی والدہ کی طرف سے تحفتاً" ملے ہوئے ایک سو روپے کے نوٹ نے مجھے گھوڑ دوڑ میں شرط بدنے پر اکسایا۔ گھوڑ دوڑ میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے، وہ مجھے سونا مائی (ایک پارسا خاتون) کی عبادت گاہ میں لے گئیں تاکہ میں "چراغ" (آتشکدہ کا نمونہ) کے سامنے سر نیہوڑاتا جاؤں۔

اگرچہ میں معترض نہیں ہوا کہ مجھے ریس کورس کی طرف دھکیل دیا جائے یا عبادت گاہ کی طرف، مجھے قطعی یقین تھا کہ دونوں جگہوں سے مجھے میری مطلوبہ رقم دستیاب نہیں ہو گی۔ دولت، ایسی آسانی سے کبھی بھی میرے ہاتھ نہیں لگی تھی۔ چونکہ میری ماں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس انداز سے امداد طلب کروں۔ میں نے اپنے طور پر خاموشی سے چند الفاظ کہے " میں یقین نہیں رکھتا کہ ایسی باتیں ممکن ہیں، میری ماں یقین رکھتی ہے۔ میں مالی دشواریوں سے دوچار ہوں۔ مجھے اشد ضروری قرضے اتارنے ہیں۔ میں احسان مند ہوں گا اگر آپ میرا بار اتارنے میں میری دستگیری کریں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کا قائل نہیں ہوں لیکن میں اس بات کا منکر بھی نہیں ہوں۔ آپ جو کوئی بھی ہیں، مجھے کم از کم، آپ کے ساتھ مخلص ہونا چاہیے۔"

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کس کے سامنے مصروف دعا تھا۔ میں نے حسب ہدایت عمل کیا۔ میری ماں نے کہا کہ اس عبادت کدہ میں کی گئی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ جونہی میری والدہ اور میں عبادت گاہ کے کمرے سے باہر آئے۔ ہم نے سونابائی کو باہر کھڑے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر متعجب ہوتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ "آؤ تم کس لئے آئے ہو؟" "مشکل" میں نے جواب دیا "اور ماں"۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور میری ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمہارا بیٹا کھرا ہے۔ میں اسے پسند کرتی ہوں"۔

میری والدہ میری مشکلات بتانے لگیں۔ سونامائی سنتی رہیں، لیکن نیم توجہ کے ساتھ، ان

کے ساتھ ایسا اکثر ہوتا تھا اور بالیقین ایسا اس لئے تھا کہ یک وقت وہ کوئی اندرونی آواز بھی سن رہی ہوتی تھیں۔ میری والدہ کی بیان کردہ میری مشکلات سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے انہوں نے رائے ظاہر کی "یہ ایک معمولی تکلیف ہے۔ یہ گذر جائے گی۔

معمولی! اس وقت میرے لئے پانچ ہزار نو صد روپے معمولی نہیں تھے۔ چونکہ والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ میں ریس کھیلنے سے گریزاں تھا۔ سونامائی نے ارشاد کیا "تم کیوں نہیں جاتے؟ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری ماں خوش ہو گی" پھر عبادت گاہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے انہوں نے فرمایا "وہ بہت مہربان ہے۔" ان کی آواز غیر معمولی تھی کیونکہ اصولی طور پر مذہبی لوگ جواء بازی کی وکالت یا حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

اپنی قسمت کی تمام حالت کو دیکھتے ہوئے راست داؤں لگانے سے اپنی تباہی کا سامان مہیا کرتا۔ لیکن حقیقت حال کے عجیب ترین پیچ در پیچ وسیلے سے' میں نے اس روز تگنے پول (شرط کی مجموعی رقم کے دو ٹکٹ) دس روپے کی معمولی قیمت سے خریدے ان میں سے ایک ٹکٹ آٹھویں گھوڑ دوڑ ــــ (جو تگنے پول کا آخری مرحلہ تھی) کے لئے تبدیل کرائے جانے کے قابل تھا۔

اس دوڑ میں تئیس گھوڑے حصہ لے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنا زیادہ آسان تھا ــــ میں بکیوں (گھوڑ دوڑ کے پیشہ ور جواریوں) کے احاطے میں انہیں داؤں لگاتے ہوئے دیکھنے گیا۔ وہاں سے کوئی سراغ نہ ملا۔ چھ گھوڑوں پر شرطیں لگائی جا رہی تھیں۔ پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ میں نے ایک بکی کے کھوکھلے کے چوبی چھجے کے شگاف میں سے چھنتی ہوئی سورج کی شعاع کو بغور دیکھا۔ وہ ایک گھوڑے کے نام پر پڑ رہی تھی۔ میں اور نزدیک ہو گیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "نظام الدین"۔ "نظام الدین!" میں اس نام کو پہچان گیا۔ یہ وہی ولی تھے جن کے دلی میں واقع مزار پر میں نے پہلی اگربتیاں روشن کی تھیں۔ مزید سوچ بچار کئے بغیر میں نے اپنا ٹکٹ بدلوا لیا۔ پھر گھڑ دوڑ دیکھنے کے لئے چبوتروں کی طرف چل دیا۔

لیکن اب' اندرونی طور پر' میں اس قدر مضطرب تھا کہ میں اپنی طاقتور دوربین کی مدد سے دیکھنے کے باوجود گھڑ دوڑ کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ موڑ پر میں اپنے (شرط لگائے ہوئے) گھوڑے کو جھنڈ میں دیکھ سکا۔ بالکل درمیانی سیدھ میں مجھے اس کی جھلک نظر آئی پھر ریلے میں دبا ہوا' دوڑ کے اس فیصلہ کن مرحلے میں حیثیت حاصل کرنے کے لئے کوششیں کرتا نظر آیا۔ پھر نظام الدین' کامیاب نکلتا ہوا دکھائی دیا اور چار گھوڑے دھندلے اختتام کے ساتھ جیت کی حد سے کوند گئے۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔ مجھے یقین تھا کہ "نظام الدین' ان چاروں سے ایک تھا لیکن جج کے علاوہ کوئی دوسرا ان میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ ان دنوں فلش کیمرے نہیں ہوا کرتے

تھے۔ جج نے نظام الدین کو کامیاب قرار دیا۔ میں نے مجموعی طور پر شرط سے تگنی رقم جیت لی تھی۔

جب حصے کا اعلان کیا گیا تو اتفاقی مطابقت اس سے بھی بڑھ کر حیران کن تھی۔ سہ چند رقم پانچ ہزار نو سو ادا کی گئی۔ میں نے وہ کچھ جیت لیا تھا جسے میں ادھار حاصل کرنے کے قابل نہیں تھا۔

میں گاڑی لیکر سونامائی کے ہاں گیا۔ تیل کے دیئے کے سامنے دو زانوں ہو کر شکرانہ بجا لایا۔ پھر والدہ کے ہاں انہیں خوشخبری سنانے جا پہنچا۔ میں نے انہیں رقم دیدی تاکہ وہ سنبھال رکھیں۔ میں اپنی تقدیر پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

یہی دن تھے جب بمبئے کرانیکل' میں نو سال ملازمت کرنے کے بعد' ایک شام مجھے ایک فوری تعمیل طلب خط ملا جو مجھے دستی گھر پر پہنچایا گیا۔ بغیر وجہ بتائے اس کے ذریعے مجھے' ایک مہینے کا نوٹس دے کر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر موجود لوگوں سے دریافت کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ اخبار کے پورے مدیرانہ عملے کو' زیریں مشین روم میں ایک متوقع ہڑتال کے خدشے پر' جبری طور پر برخاست کر دیا گیا تھا۔

ایک ہفتے کے دوران ہی ہڑتال ختم ہو گئی اور منتظمین نے میرے سمیت سارے نوٹس واپس لے لئے۔ لیکن جہاں دوسرے شکر گزار ہو کر کام پر واپس چلے گئے میں نے برطرف رہنے کو ترجیح دی۔ جیسا کہ میں نے مالک سے کہا۔ "اگر میری کسی خطاء کے بغیر آپ نے مجھے نو سالہ ملازمت کے باوجود برطرف کر دیا تو اب میری ملازمت کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے؟"

اس کے بعد' گفتگو کے دوران ہم نے طے کیا کہ ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا جائے جو سابقہ گروپ سے جداگانہ ہو۔ جس میں کرانیکل' کے مالک اور اس کے لڑکے تین حصوں کے مالک ہوں گے اور میں چوتھائی حصے کا۔ اس بندوبست کے ماتحت میں نے ان کے لئے ایک ہفت روزہ نکالا اور مکمل ایک سال تک اس پر کام کیا۔ میرے لئے ایک ہزار روپے بطور ماہوار مشاہرہ طے پائے۔ میں نے سوچا' خون پسینے کی کمائی ہے جب پہلے سال کے اختتام پر حسابات مکمل ہوئے' مجھے بتایا گیا کہ ہمیں معمولی گھاٹا ہوا تھا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ میزانیہ پر میری تنخواہ کے مقابل کے طور پر باقی تین حصے داروں کو بھی ویسی ہی ادائیگیاں دکھائی گئی تھیں' میرے خیال کے مطابق یہ حساب درست نہیں تھا۔

میں نے ٹیلی فون پر اپنی داستان الم طہمی سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ "مہربانی کر کے 'باوا' سے دریافت کریں کہ وہ مجھے کیا کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں"۔ میں نے کہا حقیقت حال کی

مار کھا کر میں ایقان کے اولین تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہی زمانہ تھا جب میری آمدنی اسی فیصد گھٹ گئی تھی۔ کتابوں کے کاروبار پر جمود طاری تھا۔ پبلشروں کی طرف سے رائلٹی قطعا" کچھ نہیں تھی۔

بہت سے لوگ اس وقت گرفتار بلا اور پریشان حال ہوں گے کیونکہ سونامائی کے ہاں میرے سوال کا جواب ملنے میں ایک ہفتے سے اوپر عرصہ صرف ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ طہمی مجھے بتائے گی۔ میں نے فوراً اس سے رابطہ پیدا کیا۔

طہمی نے فوراً مطلب کی بات کی۔ اس نے کہا "باوا" نے فرمایا ہے۔ اسے بتاؤ کہ فوراً استعفیٰ دے اور اپنا پرچہ جاری کرے" طہمی نے یہ کہہ کر اچانک گفتگو ختم کر دی "یہی کچھ ہے"۔

میں گھبرا کر رہ گیا۔ میں پہلے ہی بے حد مقروض تھا۔ میرے قرض سب سے مہنگی ادھار منڈیوں سے حاصل ہوئے تھے۔ میری واحد آمدنی وہ ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی جو مجھے لینے کی اجازت تھی۔ اگر میں استعفیٰ دیتا تو یہ بھی بند ہو جاتی۔

جب میں نے طہمی کو فوراً استعفیٰ دینے کی صورت میں مشکلات کا ذکر کیا تو اس نے یہ کہہ کر میری بات مختصر کر دی "باوا" کی طرف سے یہی جواب ملا ہے۔ انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ یہ فیصلہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟"

جب ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوئی میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے اور میرے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ میں اس قدر قلاش کبھی نہ ہوا تھا۔ میرا خدمت گار جس نے میرے ساتھ بہت سی مشکلات دیکھی تھیں اور جس کا مقامی پنساری کی دکان پر اپنا ادھار چلتا تھا' مجھے چالاکی سے بتایا کہ وہ بھی پھکڑ ہو چکا تھا۔ اس نے گھر میں سامان خورد و نوش کا جائزہ لیا۔ اس نے لاپرواہی سے بتایا کہ دوسرے روز کے ناشتے کے لئے انڈے نہیں تھے۔ ہمیں مکھن درکار تھا اور صبح ڈبل روٹی خریدنے کے لئے کچھ رقم بھی! اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے جو اس شام فوری پیدا ہو گیا تھا مجھے اپنے کلب جانا پڑا' جہاں کھانے کے کمرے کے دربان سے دس روپے ادھار لایا۔ یہ ایک ایسی سہولت تھی جو کسی حادثاتی صورت میں ممبروں کو مہیا کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے یہ بھی مراد ہو کہ اس رعایت سے اس لئے بھی فائدہ اٹھایا جائے کہ ناشتے کے لئے انڈے' مکھن اور ڈبل روٹی خریدی جائے۔

اس فوری مالی مسئلے کو حل کر کے میں نے اپنی والدہ کو ٹیلی فون کیا تاکہ انہیں اس گومگو کی حالت کے بارے میں بتاؤں جس میں' میں مبتلاء تھا۔ انہوں نے سنا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میرے والد نے مشورہ دیا کہ میں موجودہ ملازمت چھوڑنے سے پہلے کہیں دوسری جگہ کام حاصل

کروں لیکن یہ بات اس ہدایت کی موافقت میں نہیں تھی جو "باوا" کی طرف سے ملی تھی۔ ان کے بالکل واضح اور صاف الفاظ "فوری طور پر استعفیٰ دیدو"۔ ایسے الفاظ معنویت سے خالی نہیں ہو سکتے' میں نے توجیہ پیش کی۔

"ایک روحانی ذریعے سے ایک پیغام مل جانے کی وجہ سے ایک آدمی اپنی قوت فیصلہ سے دست بردار نہیں ہو سکتا" میرے والد صاحب نے جرح کرتے ہوئے کہا "تمہیں سوچنا چاہئے کہ تم کیسے گذر بسر کرو گے؟" بعینہ یہی کچھ میں کر رہا تھا۔ سوچ بچار۔ لیکن میں گھبرایا ہوا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا تاکہ صبح تازہ دم ہو کر سوچ سکوں۔ فی الواقع فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا۔ خواہ میں "باوا" کی اندھی تقلید کرتا' چاہے میں ان کے مشورہ کو اعتدالی توجیہ کے سانچے کے مطابق گھما پھرا کر موزوں کر لیتا۔

اگلی صبح میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں نے حقیقت بینی سے محسوس کیا کہ ایک ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلا کر اور پھر اس کی جگہ خود نسخہ تجویز کرنا بے معنی تھا۔ اسی روز بعد دوپہر میں اپنے حصے داروں سے ملنے گیا۔ "آج سے ایک مہینہ بعد" میں نے انہیں بتایا "میں آپ سے علیحدہ ہو جاؤں گا" ــــــ انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔

دوسرے روز' میں نے غور کرنا شروع کیا کہ میں ایک نیا ہفت روزہ کیسے جاری کر سکتا تھا۔ دس روز کے اندر میں نے مرکزی طور پر اسی ہزار روپے کے سرمایہ شراکت کے ساتھ بنیاد فراہم کر لی۔ آٹھ ہفتوں کے بعد 25 ستمبر 1949ء کو بمبئی کی شاہراہوں پر "کرنٹ" کا پہلا شمارہ فروخت ہو رہا تھا۔ اس کے پہلے صفحے پر میں نے ایک "منشور اقرار" دوسروں پر واضح کیا۔ وہ اس طرح تھا:

میں یقین رکھتا ہوں سب سے بڑھ کر خدا پر اور اس کی عظمت پر اور ہر بشر کے اس پیدائشی حق پر کہ وہ اپنے طور پر مذہبی طرز عبادت رکھے۔

میں یقین رکھتا ہوں بشر پر اور اس کی عظمت پر' اس کے حق پر کہ وہ ایک آزاد اور کافی زندگی بسر کرے' اس کے حق پر کہ وہ آزادی کی کھلی ہوا میں سانس لے سکے' جہاں کہیں بھی آزادی کا اعلان ہوا ہو۔

میں یقین رکھتا ہوں جمہوریت پر اور یہ کہ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ حکومت عوام کی' عوام کے ذریعے اور عوام کے لئے ــــــ اور کچھ نہیں۔

میں یقین رکھتا ہوں آزادی پر' اس نام کے خاص مقبول معنی پر نہ کہ ہمارے مقامی طور پر تبدیل شدہ' گھٹاتے گھٹاتے کم کئے ہوئے مفہوم پر۔

میں یقین رکھتا ہوں اس وسیع تر آزادی کے اجزائے ترکیبی پر جن کے لئے عزت نفس رکھنے والے تمام مرد آرزو رکھتے ہیں: آزادی گفتار' آزادی اظہار' آزادی مذہبی عقیدہ' آزادی اجتماع عوام' ــــــ آزادی از افلاس' خوف اور بھوک وغیرہ وغیرہ۔

تیسرا باب

سیاہ شدہ ہتھیلی' تبدیلی آواز

میری والدہ اکثر مجھ سے دعا کے ذریعے غیر معمولی احساس طمانیت قلب کا ذکر کرتی تھیں جس کا انہیں خود تجربہ تھا اور حیران کن روحانی مظاہر کا' جن سے وہ آگاہ تھیں' کبھی کبھار جب ہمیں' یعنی ان کے بالغ بچوں کو' کسی ذاتی مشکل کا سامنا ہوتا تو ہم انہیں کہتے کہ وہ ہمارے لیے دعا کریں اور اس بارے میں مزید بتائیں۔ میرے اندر ایک فطری تعرض تھا کہ منطق اور استلال کی قوت کو مغلوب کرکے' روحانی طاقت پر اعتماد کیا جائے یا مسئلہ تقدیر کو مان کر یہ قبول کیا جائے کہ دعا کی طاقت سے نظام واقعات کو بدلا جاسکتا ہے۔ دعا میرے نزدیک ایک رسم عبادت تھی' اس عمل کا ایک حصہ جو خدا کا احساس رکھنے والے کو بجالانی تھی۔ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل بات تھی کہ دعا اثر کی حامل ہوتی ہے یا روحانی قوتیں کوئی وجود رکھتی ہیں جو ہم زندوں پر آشکارا ہوسکتی ہیں۔ یا یہ خیال کہ کسی اور کو ایسی قوتوں' جیسا کہ خدائے برتر' سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ ناقابل یقین بات تھی۔ تاہم جب میں اپنی والدہ کو' کتاب ہاتھ میں لئے اور اپنے سر کو ایک چھوٹے سے پھولدار رومال سے ڈھکے ہوئے ' ژندو اوستا (پارسیوں کی مذہبی) کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا تو اکثر انہیں کہتا "میرے لئے دعا کیجئے"۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا تم خود نہیں کرسکتے" وہ جواب دیتیں۔

"میری دعائیں کوئی نہیں سنے گا۔ دعا یکسوئی چاہتی ہے جو آپ نے مشق سے حاصل کی ہے۔ اگر میں دعا کرنے لگوں تو میرا دھیان کسی عورت یا ریس کے گھوڑے یا تاش کی بازی کی طرف بھٹک جائے گا۔ اس کے برعکس آپ کی دعا صاف' رجوع قلب لئے مخلصانہ ہوگی۔ اور یقیناً آپ اپنے بیٹے کے لئے دعا کرسکتی ہیں۔

"میرے بیٹے' بہرحال میں تمہارے لئے دعا کروں گی" وہ جواباً کہتیں "لیکن جو تم کہتے ہو وہ درست نہیں۔ تم یہ یقین ہی نہیں کرنا چاہتے کہ تم بذات خود ایمان ایسی چیز حاصل کرسکتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ کوئی دوسرا تمہاری جگہ ایمان لائے۔ میں ان سے اتفاق رائے کرتا کہ اپنی نجات کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالنا زیادہ آسان تھا۔ میں اقرار کرتے ہوئے کہتا "آپ کی دعائیں قبول

ہوں گی، میری نہیں"۔

"تم نے کبھی آزمائش نہیں کی۔ لیکن عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاید تم اس بات پر رضامند ہو جاؤ کہ اپنے خالق کے سامنے اپنے آپ کو عاجز خیال کرو۔ تمہارے اندر بس۔ یہی کمی ہے، انکساری"۔ یہ سرسری گفتگو کا محض ایک حصہ تھا جو ماں اور بیٹے کے درمیان ایک شام ہوئی جبکہ انہوں نے اپنی روز مرہ عبادت ختم کی تھی۔

والدہ بعض اوقات ایک پارسی خاتون کا ذکر کیا کرتیں جنہیں وہ جانتی تھیں، جو درمیانی عمر کی اور ایرانی نسل سے تھیں۔ جنہیں ایک نادر بخشش عطا ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی دعا پر مشتمل ایک کلام پڑھ لینے سے وہ اسلام کے ایک بڑے ولی کی حضوری حاصل کر کے ان سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر سکتی تھیں۔ یہ کام ایک اور روح کے ذریعے سے کیا جاتا، جو معلوم ہوتا ہے، کہ درمیانی واسطہ کا کام سرانجام دیتی تھی۔ ابتدائی مرحلوں میں یہ اتنا پیچیدہ تھا کہ اس کا سمجھنا محال تھا اور اس نے اسکی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اسکی تفصیلات میں جاؤں کہ یہ کیسے ہوتا تھا۔ میں اتنا کافی سمجھتا تھا کہ اپنا سوال یا مسئلہ اپنی والدہ سے بیان کرتا جو اس پارسی خاتون سے دریافت کرتیں۔ چند دنوں کے بعد مجھے جواب بتا دیا جاتا۔ اس جواب پر میں غور کرتا، لیکن اس پر عمل کرنا کچھ ایسا ضروری نہ سمجھتا۔ میں محسوس کرتا کہ مجھے اپنے اہم مسائل میں اپنی قوت فیصلہ پر بھروسہ کرکے حتمی فیصلہ کرنا چاہیے۔

یہ قوت اور کلام جو ایک نیک بزرگ کی طرف سے اس پارسی خاتون کو عطا تھی، صرف وہی واقف تھی۔ وہ بزرگ جنہوں نے اپنی زندگی میں معجزانہ کام کیے تھے، ایک درگاہ کے متولی تھے جو کاکوری میں، لکھنو سے چودہ میل دور، تکیہ شریف کہلاتی تھی۔ تکیہ شریف میں صوفیا کے ایک سلسلے کے "قلندر شاہ" مدفون ہیں۔ یہاں دو الگ شیشے کے خانوں میں حضرت رسول خدا صلعم، حضرت علی علیہ السلام کے موئے مبارک ہیں۔ موء علیؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نادر ہے کیونکہ اصل موء مبارک سے کئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

اس خاتون کو استحقاقاً" یہ اجازت بھی حاصل تھی کہ وہ اپنے گھر میں ایک "دیا" روشن رکھیں۔ ایک سادہ سا دیا، جو ہر خاتون خانہ روشنی کیلئے گھر میں جلاتی ہے اور جو کسی چوکور شیشے۔ چھپے پیندے والے برتن میں روئی کی بتی اور میٹھے تیل پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر میری والدہ کی دوست پر خاص بخشش کی وجہ سے اس خاتون کی عبادت گاہ میں روشن اس دیئے کے متعلق مشہور تھا کہ جو شخص بھی مشکل کے وقت اس دیئے کے سامنے دعا مانگتا، اسکی دعا کبھی رد نہیں ہوتی تھی۔ میری والدہ، جو گاہے گاہے اس پارسی خاتون کے ہاں جایا کرتی تھیں، کا کہنا تھا کہ انکی کئی

دعائیں مستجاب ہوئی تھیں۔ ہمیں اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بخشش کا عطا کرنے والا کون تھا۔ اور وہ کونسی روح تھی جو مدد کے لئے ان بے شمار عرض داشتوں کو سنتی تھی؟

میں اکثر ان دلچسپ قصوں کو جو والدہ بیان کرتی تھیں' شوق سے سنا کرتا تھا مگر میں ان پر یا مافوق الفطرت روحانی قوتوں پر زیادہ یقین کرنے کا قائل نہیں تھا۔ مزید برآں' اس وظیفے کا مسلمانوں سے متعلق ہونا ہمارے اپنے زرتشتی مذہب سے دوری کے مترادف معلوم ہوتا تھا۔

"مگر ہم مسلمان نہیں ہیں" میں نے اپنی ماں سے کہا جو خود بھی راسخ پارسی تھی۔ "نہ ہی وہ (خاتون) ہے" والدہ نے اس پارسی خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے یہ روحانی قوتیں حاصل کی تھیں۔ "تمہیں خود ایک دن وہاں جا کر اس سے ملاقات کرنی چاہیئے۔ میں تمہارے متعلق اسے بتا چکی ہوں"۔

آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ کتابوں کا مصنف ایک صحافی جو ابھی اپنے ملک میں اپنا مقام پیدا کر رہا تھا' ایک خوش ذوق نوجوان جو "سیول رو" کے سلے ہوئے قیمتی سوٹ پہننے کا شوقین تھا' ایک رقاص' جس نے پیرس کی نائٹ کلبوں کو چھان مارا تھا۔ ایک کنوارا جو عورتوں' گھوڑ دوڑ اور تاش کی بازیوں' برج پوکر وغیرہ پر بڑے داؤ لگا کر کھیلنے کا رسیا تھا۔ جو بھرپور زندگی بسر کرنے کا شعور اور شوق رکھتا تھا اور اکثر ہفتے کے سات دن مدعو رہتا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم ان باتوں کے قائل نہیں ہو" میری ماں نے کہا "مگر تم کہتے ہو کہ ایک صحافی کو ہر داستان کے متعلق دریافت کرنا چاہیئے۔ ایسی حکایت تمہارے لئے یقیناً دلچسپ ہونی چاہیئے"۔

جب انہوں نے اس بات کو مذہب سے قطعی ہٹ کر' صحافت کے پیرایہ میں بیان کیا تو گویا انہوں نے میری دکھتی رگ پکڑ لی۔ میں مجبور ہو گیا کہ اس مظہر قدرت کا مشاہدہ کروں' جس کا وہ ذکر کرتی تھیں' اس یقین کے ساتھ کہ میں ان کے اعتقاد میں خامی ڈھونڈھ نکالوں گا ___ مجھے یہ گھمنڈ تھا کہ مذہب اور اوہام پرستی' صرف کمزور اوسط درجے کے ذہنوں کے لئے تھیں۔

تاہم' ہندوستان واپس آنے کے بعد مجھے دست شناسوں' قسمت کا حال پڑھنے والوں اور پنڈتوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بہرحال' کچھ دنوں کے بعد میری والدہ نے مجھے بتایا کہ مجھے "بیٹھک" کی اجازت مل گئی تھی اور میں خوش قسمت تھا ___ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ 'بیٹھک' سے ان کی مراد ایک نشست تھی یعنی روحانی مجلس۔ وہ روح جو پارسی خاتون کی مدد کرتی تھی فی الحقیقت اس وقت موجود ہو گی۔ یہ ایک طرح سے ___ بالمشافہ ملاقات ہو گی۔ مجھے تاریخ اور وقت بتا دیا گیا اور میں نے محض دلچسپی کی خاطر مقررہ وقت پر بائی کولہ میں واقع ایک

منزلہ مکان پر جا پہنچا اور گھنٹی بجائی۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ اگر اتنی بڑی روح اس کی مددگار تھی تو پھر وہ ایسی معمولی جگہ کیوں رہ رہی تھی؟

اس خاتون کا نام سونا ایرانی تھا۔ وہ احتراما" سونا مائی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی ایک ملے پالک ایرانی لڑکی طمی تھی جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ سونامائی درمیانی عمر کی ناکتخدا عورت تھی۔

طمی نے دروازہ کھولا اور مجھے کمرہ عبادت میں لے گئی جس میں انبیاءؑ اور بزرگوں کی کچھ تصاویر آویزاں تھیں ____ پیتل کا ایک کٹہرا اس کمرے میں آنے والوں کو سنگ مرمر کی اس میز سے الگ رکھتا جس پر 'دیا' روشن رہتا تھا ____ یہ 'دیا' شیشے کا معمولی کا سہ ہونے کی بجائے' ایک طشتری کی مانند تھا اور اصلی چاندی کا تھا۔ اس میں جلنے والا روغن بھی عام تیل کی بجائے خالص گھی ہوتا تھا' جو کسی زمانے میں ہندوستان میں کھانا پکانے کے لئے استعمال ہوتا تھا ____

مجھے بتایا گیا کہ میں دعائیں مانگ لوں تاوقتیکہ مائی تیار ہوں' پھر مجھے بلایا جائے گا۔ میں نے نئے شائق کے انداز میں ان چیزوں کے لئے دعائیں مانگیں جو اس وقت میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھیں ____ گھڑ دوڑ میں خوش نصیبی' تاش کی بازیوں میں روانی ____ اور دولت کی فراوانی! مجھے یقین تھا کہ دولت کے ساتھ میرے سارے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ چونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ میں جو چاہوں مانگ لوں' اس لئے میں نے وہی کیا جو مجھے اپنے مادہ پرستانہ انداز میں کرنا چاہئے تھا۔ مکار کیوں بنا جائے؟

تھوڑی دیر بعد' ایک طرف کا دروازہ کھلا اور مجھے اندر بلا لیا گیا۔ سونامائی ہندوستانی معیار کے لحاظ سے دراز قد عورت تھی۔ اس کی آنکھیں فکر کی گہرائی لئے ہوئے اثر انگیز تھیں اور چہرے پر خوشگوار' استقبالیہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے لبوں کی ہلکی جنبش سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خاموشی سے دعا پڑھ رہی تھی۔ مجھے اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ جبکہ طمی نزدیک ہی ایک بید کے سٹول پر بیٹھ گئی۔

"تمہاری ماں اکثر تمہارا ذکر کرتی رہتی ہیں" سونا مائی میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مخاطب ہوئیں۔ میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا کہ کہیں وہ میرے شکوک و شبہات اور بے یقینی کے خیالات نہ معلوم کر لے۔

"میں تمہیں ملنا چاہتی تھی" انہوں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئے۔"

میں نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ انہیں اپنی اندرونی کشمکش کے متعلق وضاحت کر دوں۔ میں نے بتایا "مس ایرانی' آپ جانتی ہیں میں ایک تعلیم یافتہ

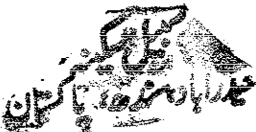
رہا۔ اپنی والدہ کی باتیں سنکر، مجھے، اس میں زیادہ قریب ہو کر، الجھنے کی خواہش نہ کرتے ہوئے مافوق الفطرت قوتوں سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

میں نے جو انداز اختیار کیا وہ یہ تھا کہ یہ دیندارانہ زندگی گزارنے والوں کے لئے فرصت کا مشغلہ ہے جو بلاشبہ ایک سودمند قوت کا حامل ہے لیکن بہت زیادہ دنیا دار اور دنیاوی طور پر زیادہ مادی جھکاؤ رکھنے والے ایسی قوت اخذ کرنے یا اس کے حصول سے پہلے مذہبی رسوم کی ادائیگی کے طریقے کو اپنانے کے اہل نہیں تھے۔

اگرچہ میں سوناماؤ کے نئے مکان پر، سوائے گاہے گاہے اپنی والدہ کو وہاں پہنچانے کے لئے جانے کے، نہیں گیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس تعلق سے میری ماں کو بے انداز روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔ لہٰذا میں ان کی سوناماؤ کے ساتھ رفاقت سے خوش تھا۔ بعض اوقات، جب مجھے مشکل حالات کا سامنا ہوتا، مالی، سیاسی یا جذباتی طور پر، تو میں اپنا غیر معمولی مسئلہ والدہ کو بتا دیتا، جسے وہ سوناماؤ سے بیان کرتیں اور مجھے ان کی طرف سے ہدایت یا مشورہ مل جاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن میں والدہ کو واسطہ بنا کر، خود الگ رہا ___ سوناماؤ کے جوابات مجھے اپنا فیصلہ مرتب کرنے میں ممد ثابت ہوتے لیکن اب بھی میں اس بات پر قائم رہا کہ تمام معاملات میں آخری فیصلہ ہمیشہ میرا اپنا ہو گا۔ میرا پختہ یقین تھا کہ میں بذات خود اپنا مستقبل بنا سکتا تھا۔ میں اس نظریہ سے سرکنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

یہی دن تھے کہ مجھے اپنے گھر میں ایک اور انوکھا مظہر قدرت دیکھنے کا اتفاق ہوا جس نے مجھے اس وقت سراسر چکرا دیا۔ مافوق الفطرت کی ایک مثبت مثال جس کا مشاہدہ میں نے اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ وہ شخص جو اس عجوبہ کا محور تھا ایک نہایت مفلس آدمی تھا۔ نرم خو اور نقیہ آواز کا حامل، جو اپنی ہستی پر منفعل نظر آتا تھا۔ اس کا نام کاموں بھائی تھا۔ اسے میرے ایک چچا ہمراہ لائے تھے۔

ایک روز، قبل از دوپہر جبکہ میں اپنے اخبار کے دفتر میں کام میں منہمک تھا کہ مجھے والدہ نے فون کیا۔ انہوں نے دھیمی آواز میں، تاکہ ان کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ نہ سن لیں آگاہ کیا کہ میرے چچا کے ہمراہ اچانک ایک عجیب الفطرت انسان آیا ہوا تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ روحانی قوتوں کا مالک ہے۔ اگر میں اس کا مشاہدہ کرنے کا واقعی شوق رکھتا تھا تو میرا خود وہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ انہوں نے چونکہ یہ نادر چیز خود نہیں دیکھی تھی اس لئے اس بارے میں کچھ یقینی بات نہیں کہہ سکتی تھیں۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے حیلے بہانے کئے، کار میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔



بے اعتقادی کی شدت تھی جو زیادہ تر بیرونی ممالک میں رہ کر احساس حقیقت پسندی کی تاکیدی علامت تھی۔ مافوق الفطرت معاملات کو میں اوہام پرستی کا لازمہ قرار دیتا تھا جو صرف جاہلوں کی قوت تھی۔ ایسا میلان طبع رکھتے ہوئے یہ قدرتی امر تھا کہ میں ہر شے کو غیر معتقدانہ انداز میں دیکھتا تھا۔ میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار تھا کہ معمولی روحانی واسطہ رکھنے والے لوگ خاص اوقات میں مستقبل کی جھلک یا سرسری جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں ابھی تک اپنے عقیدے پر جما ہوا تھا کہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ میں خود اپنا مستقبل بنا سکتا تھا۔

مشرق اور بالخصوص ہندوستان روحانی قوت سے بھرپور ہے۔ سوناماَئی بھی غالباً" اس کی ایک نظیر تھی۔ میرے خیال میں وہ غیب دان تھی' ایک پارسا باطن' نیک نیت خاتون جو اس صلاحیت کی حامل تھی' جسے وہ اپنے پاس آنے والوں کی تکالیف دور کرنے کے لئے کام میں لاتی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہربان روح جس نے میرے سوالات کے جوابات عطا کئے تھے کون تھی یا اس نے میرے مستقبل کی چھان بین کرنے کی مروت کس لئے کی تھی!

چند روز بعد جب میری والدہ نے مجھ سے میرے اولین تجربے کے ردعمل کے بارہ میں دریافت کیا تو میں نے انہیں بتایا "یہ نہایت دلچسپ تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میں اس پر ہی اکتفا کروں گا۔ میں اب بھی اپنی رائے کے مطابق عمل کروں گا اور اپنے فیصلے خود کروں گا" ـــــ میرے اندر اپنی ذات پر بھروسہ اسی طرح محکم تھا جس طرح کہ پہلے تھا۔

"پھر بھی" میری والدہ نے قدرے عذر خواہانہ طور پر کہا "میرا خیال تھا اس سے تمہیں دلچسپی پیدا ہو گی" ـــــ یہ معاملہ کافی عرصہ یہیں تک محدود رہا۔

کئی سالوں کے بعد سوناایرانی نے بائیکولا کے درمیانی طبقہ کے علاقے سے اپنی سابقہ معمولی جائے رہائش بدل کر میرین ڈرائیو پر واقع زیادہ عمدہ کوٹھی میں چلی گئیں جو میری والدہ کے مکان سے نزدیک تر تھی۔ نتیجے کے طور پر ان کے درمیان ملاقاتیں جلدی ہونے لگیں۔ اپنے گھر میں شام کی عبادت کے بعد میری ماں سوناماَئی کے ہاں عبادت گزاری کے لئے جا پہنچتیں۔ وہ وہاں اگربتیاں جلاتیں اور دیئے کے سامنے تعظیم بجا لاتیں۔ وہ 'دیا' جس کے سامنے' اس گھر میں جانے والے اپنے بیسیوں مسائل کی بہتری کے لئے طالب امداد ہوتے تھے۔ پھر سوناماَئی اور میری ماں مل بیٹھتیں اور باتیں کرتیں۔ اسی دوران دونوں آپس میں گہری دوست بن گئیں۔

اگرچہ میں جانتا تھا کہ میری ماں کی اس عبادت خانے سے گہری اور مسلسل وابستگی قائم تھی چونکہ میری زندگی سکون سے گزر رہی تھی' مجھے سوناماَئی کے ہاں خودبخود جانے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوئی۔ بہرحال' میں وقتاً" فوقتاً" وہاں جانے والے لوگوں کے متعلق دلچسپ واقعات سنتا

یہ طرفہ گفتگو تھی۔ جب مجھ سے کہا جاتا میں بولتا' مس ایرانی میرے سوالات دہراتیں کیونکہ صرف وہی اس روح' سے ہم کلامی کی مجاز تھیں جس کا عکس طمی اپنی سیاہ ہتھیلی میں دیکھ سکتی تھی۔ طمی صرف جوابات بتاتی تھی جو وہ اپنی ہتھیلی پر روح' کے عکس کی جنبش لب سے پڑھ لیتی تھی۔ ہمارے علاوہ وہاں کسی اور کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

یہ ماجرا تیس سال قبل پیش آیا تھا اس لئے مجھے صحیح طور پر یہ یاد نہیں کہ میں نے کیا سوالات کئے تھے اور ان کے کیا جوابات ملے تھے۔ لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ اپنے مسائل اور ذہنی تکدر' جس سے میں دوچار تھا' بیان کر لینے کے بعد جو جواب روح' کی طرف سے ملا یہ تھا۔

"میں جاؤں گا اور معلوم کروں گا' پھر میں تمہیں بتاؤں گا"۔

"جاؤں گا' ___ کہاں؟ میں نے ایک تقدس ماب باریش عارف باللہ کا تصور کیا جو کہیں دور افتادہ محافظ خانے میں' جہاں صرف چند منتخب غیب دانوں کی رسائی ہو سکتی تھی' کتاب مقدر کے اوراق کو الٹتے پلٹتے دیکھا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ ایک شخص کی تمام زندگی طے شدہ تھی اور اس کی اندر آزادی رائے کی گنجائش انتہائی محدود تھی۔ اس طرح وہ غلط تصور' جو میں نے کاوش سے پروان چڑھایا تھا کہ فرد اپنی قسمت بنانے کا خود مجاز تھا' پاش پاش ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ انتظار کرنا اور دیکھنا کہ وہ روح مقدس کیا جواب لاتی تھی' بہتر تھا۔

تقریباً بیس منٹ جب تک کہ وہ بزرگ روح غائب رہی' ہم تینوں' ایک دوسرے سے مصروف گفتگو رہے۔ میں نے سونامائی سے دریافت کیا کہ وہ بزرگ' مستقبل شناسی کے لئے کہاں جائیں گے؟ میرے سوالات کے جوابات وہ کہاں سے معلوم کریں گے؟

"میرے عزیز! یہ باتیں' ہمیں معلوم نہیں ہیں' ہمیں انتظار کرنا چاہئے کہ وہ کیا جواب لاتے ہیں" انہوں نے جواب دیا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس صبح خاص طور پر یہ بات معلوم کی تھی کہ جس لڑکی کا نام میں نے اپنے سوال میں درج کیا تھا اس سے شادی کا امکان تھا۔ اس کے متعلق' جب وہ روح مقدس' طمی کی ہتھیلی پر جواب دینے کے لئے لوٹ آئی' تو اس کا تاکیدی جواب تھا 'نہیں' تمہاری یہ دل بستگی شادی پر منتج نہیں ہو گی اگرچہ تم ہمیشہ اچھے دوست رہو گے۔ تم دونوں اپنی اپنی برادری سے باہر شادیاں کرو گے" ___ مجھے اس جواب سے مایوسی ہوئی اور میں اس پر اعتبار کرنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن وقت نے اس پیش گوئی کو سچا ثابت کر دکھایا۔

میرے بہت سے سوالوں کے مثبت اور خوش آئند جوابات کے باوجود' میں مجموعی طور پر بیٹھک سے غیر متاثر رہا۔ شاید میں اس وقت تک اس کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ میرے اندر

شخص ہوں۔ میں یقیناً خدا کو بے وجود حیثیت میں مانتا ہوں لیکن میرے خیال میں وہ مجھ ایسے آدمی سے دور ہے جو سرگرمی سے ترک دنیا نہیں کرتا۔ جو کچھ میری والدہ نے مجھے بتایا ہے میرا اس پر یقین ہے۔ مگر چونکہ میں خود ایک دیندارانہ زندگی نہیں گزارتا میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ویسا یقین تو نہیں حاصل کر سکتا جو آپ جیسے لوگ رکھتے ہیں۔ بہرطور' اگر آپ میرے مستقبل کی بابت کچھ بتا سکیں تو میں پوری دلچسپی سے سنوں گا۔"

اس دوران سوناماٰئی نے سر کو اپنی ساڑھی سے ڈھانک لیا تھا اور میری بات سنتے ہوئے اس کے ہونٹ برابر ہلتے رہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اصل کلام کو پڑھنے سے پیشتر یہ دعا کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ پھر وہ بولیں "میں قسمت کا حال بتانے والی نہیں ہوں۔ عموماً" جو روح آیا کرتی ہے وہ میرے اور طمی کے علاوہ کسی اور کی موجودگی میں آنے سے گریز کرتی ہے۔ تاہم' جب میں نے معلوم کیا کہ میں ہومائی کے بیٹے یعنی تمہیں بلا سکتی ہوں تو مجھے کہا گیا کہ بیشک۔ للذا تم بڑے خوش نصیب ہو۔"

ہومائی میری ماں کے نام کا پہلا لفظ تھا۔ اس وقت اس خاص عنایت کی معنویت سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اور اس قصے کو محض انوکھی دل لگی سمجھتے ہوئے' میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ ان کے سامنے باادب رہوں اور اس ساری تکلیف کے لئے جو وہ میری خاطر اٹھا رہی تھی' اظہار ممنونیت کروں۔ طمی نے جو اب ایک ہلکے رنگ کا ریشمی رومال سر پر اوڑھے ہوئے تھی' اب سرمے جیسی سیاہ کریم اپنی داہنی ہتھیلی پر ملنے لگی تھی۔ وہ اپنی سیاہ کھلی ہوئی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کے ذریعے کلائی سے پکڑے ہوئے بیٹھ گئی۔ ہم چند لمحے اور بے تکلف گفتگو کرتے رہے۔

"وہ آسانی سے ایسی عنایات" سے سرفراز نہیں فرماتے" سوناماٰئی نے ایک مرتبہ پھر تاکید کی "اس لئے جب وہ تشریف لائیں تم جو چاہتے ہو پوچھ لینا۔"

'وہ' کون تھے؟ وہ کہاں تھے؟ وہ میرے لئے کیوں آرہے تھے؟ وہ اس کلام کی بدولت' جو سوناماٰئی پڑھتی نظر آرہی تھی' خلاء سے کیسے آسکتے تھے؟ یہ سب کچھ بعید الفہم تھا مگر مجھے اس کے معلوم کرنے کی جلدی نہیں تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا میں اس کے لئے آمادہ انتظار رودید تھا۔

چنانچہ ہم تینوں' کچھ دیر تک اور بات چیت کرتے رہے کہ اچانک کم عمر طمی نے اپنی ہتھیلی اونچی کی اور اپنا سر اس کے آگے جھکا دیا۔

"وہ تشریف لے آئے ہیں" اس نے دھیمی آواز میں مس ایرانی کو آگاہ کیا جس نے اپنے دونوں ہاتھ تعظیماً" جوڑ لئے اور بیٹھک' جیسا کہ اسے کہا جاتا تھا۔ شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یہ

جب میں والد کے مکان پر پہنچا تو ساری فیملی' مع میرے چچا کے' گھر کے ایک اندرونی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایک روشن کمرہ تھا جس کے دونوں طرف کے برآمدے ہوا کیلئے کشادہ تھے۔ مجھے کاموں بھائی سے متعارف کروایا گیا۔ اس نے فوراً مجھے میرے گھریلو نام سے پکارا جو اگرچہ میرے لئے تعجب انگیز تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کیونکہ میرے والدین نے اسی نام سے میرا ذکر کیا تھا۔ اس کی شخصیت پراثر نہیں لگتی تھی۔ وہ کمزور مگر بانسری کی طرح تیز آواز میں بات کرتا البتہ اس میں ہلکی زندہ دلی کا عنصر تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر وہ نہایت سلیم الطبع انسان تھا۔ وہ انکسار کا مجسمہ تھا۔ وہ سفید سوتی پتلون اور دودھیا رنگ کی ریشمی قمیض پہنے ہوئے تھا جو پتلون کے اندر نہیں سمیٹی گئی تھی۔ اس کے اوپر اس نے بہت ہی ڈھیلا ڈھالا سفید و سیاہ' دھاری دار پرانا کوٹ پہنا ہوا تھا جس کا کالر گھسا ہوا تھا۔ ریشمی قمیض اسے ایک ٹیکسٹائل مل کے امیر مالک کی طرف سے ملی تھی۔ حقیقتاً جو کچھ اس کے پاس تھا وہ اس کو تحفتاً" ملا ہوا تھا۔ لوگ جو کچھ اسے پہننے کو دیتے وہ پہن لیتا۔ اس کے سر کے بال خشخشے اور سیاہی ملے سفید تھے اور اگرچہ اس نے داڑھی نہیں رکھی ہوئی تھی اس کی داڑھی مونڈی ہوئی بھی نہیں تھی۔ جب میں پہنچا تو کاموں بھائی بیت اور لکڑی کی بنی ہوئی قدیم طرز کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو پچاس سال سے ہمارے گھرانے میں چلی آ رہی تھی۔ اس نے سلیپر اتار رکھے تھے۔ پاؤں اٹھا کر' چوکڑی مار کر اس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سادہ' چھوٹا سا آدمی' انتہائی بے ضرر' جو تقریباً تیز لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے ہمارے گھر کی ہر بات میں دلچسپی ظاہر کی اور اس نے بچوں کی طرح ہر معمولی بات پر' جو اسے بتائی گئی بچوں کا سا تعجب ظاہر کیا۔ اس کو سمجھانے کیلئے ہر بات کو سادہ انداز میں بیان کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے بارے میں اسکے سوالات بھی سادہ تھے۔ زیادہ تر میرے والدین کو مخاطب کرتے ہوئے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان کے کتنے بچے' ان کی عمروں میں کتنا تفاوت تھا' اب وہ کیا کر رہے تھے۔ اس نے کالجوں اور تعلیم کے بارے میں حوالے دیئے۔ اس نے اپنے انداز میں' میری بدیسی تعلیم کا حوالہ دیا۔ نہ معلوم میرے چچا نے ان سے دوران گفتگو میرے متعلق ذکر کیا تھا یا یہ اس کی روحانی قوت کا انکشاف تھا لیکن ہم میں سے کسی نہ کسی کے متعلق کئی چھوٹے اشاروں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ زیادہ علم رکھتا تھا بہ نسبت اس کے جو ایک اجنبی کو ہونا چاہیے۔ لیکن اس نے ایسا کچھ بھی نہ کہا کہ اس سے دریافت کیا جاتا "آپ یہ کس طرح جانتے ہیں؟"

حیران کن بات یہ تھی کہ وہ میرے متعلق زیادہ مشہور باتیں نہیں جانتا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں ایک اخبار میں کام کرتا تھا اور میں کئی کتابیں لکھ چکا تھا۔ ایسی معلومات اسے بڑا متاثر کرتی

تھیں۔ اس نے تعریف کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے چلا کر کہا "تم کتابیں لکھتے ہو"۔ ہر بات اس پر اثر انداز ہوتی تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ کتنے سادہ ماحول میں پلا بڑھا ہے۔ وہ بغض سے قطعی مبرا تھا اسے کوئی حسد نہیں تھا کہ لوگوں کے پاس کیا کچھ تھا۔ وہ اپنی سلامت روی کی زندگی پر شرمسار یا مضطرب نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی مشکلات میں کام آکر ان کی مدد کرنے کیلئے بے چین نظر آتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ ایک ایسا شخص جو دنیاوی مال و منال سے تہی دامن تھا کس طرح دوسروں کی مالی مشکلات حل کر سکتا تھا۔ مجھے اس پر بھی یقین کرنے میں عذر تھا کہ اس جیسے سادہ آدمی سے کوئی روحانی طاقت کیسے ظاہر ہو سکتی تھی۔

ایک مرتبہ اتفاقیہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا ذکر بھی کیا گیا جو بیماری کے زمانے میں اس کی دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔ اس وقت وہ ان کی مالا بار ہل' بمبئی میں واقع قیمتی جائے رہائش میں قیام پذیر تھا۔ لیکن کاموں اصل میں اپنی بیوی' منی اماں کے ساتھ' بمبئی کے غریب اور مشتبہ علاقے کماٹھی پورہ کی ایک چھوٹی گلی میں واقعہ کرائے کے ایک کمرے' جو کوہلی کہلاتا تھا' میں رہائش پذیر تھا۔ جس کے ارد گرد کسبیوں' دلالوں اور رنڈیوں کی دکانیں' تیسرے درجے کی گانے والیوں کی بھدی آرائش والی کاروباری جگہیں' سستے ریسٹورنٹ' عطائی حکیموں' غیر قانونی جوا خانے' چرس اور بھنگ پینے کے اڈے بکھرے پڑے تھے۔ ایسی جگہ کو ایک پارسا آدمی سے مشکل ہی سے نسبت ہو سکتی تھی۔

"آپ ایسا آدمی کماٹھی پورہ میں کیسے رہ سکتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا "وہ بدنام علاقہ ہے" میں نے محتاط انداز میں بات کی تھی۔

"مجھے علاقے سے کیا واسطہ؟" اس نے' خود میرا نظریہ 'کہ خاک ہر ایک کو آلودہ نہیں کر سکتی' دہراتے ہوئے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ وہ لوگ جو خائف رہتے ہوں اور اپنے آپ پر اعتماد نہ رکھتے ہوں ارد گرد کی گندگی سے آلودہ ہوتے ہیں یا خود اس میں جذب ہو جاتے ہیں۔ لیکن کاموں نے اپنے جواب میں کچھ اور بھی بیان کیا جس سے اس کی انکساری کی وضاحت ہوتی تھی جو اس میں فطری تھی یا جسے اس نے سالہا سال کی عبادت سے حاصل کیا تھا۔

اس نے کہا "اور مجھے شہرت حاصل کرنے سے کیا غرض ہے؟" اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنی بات کی تشریح کی "جہاں مجھے حکم دیا جائے' میں قیام کرتا ہوں"۔

"کس کا حکم؟" میں نے فوراً دریافت کیا۔

"بابا ___ اور کون؟" ___

لفظ بابا تشریح طلب ہے۔ یہ عربی اور اردو میں والد کیلئے بولا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ایک

اور زبان گجراتی میں باپ کیلئے لفظ 'باوا' ہے۔ دونوں الفاظ متعلقہ زبانوں میں ہم معنی ہیں۔ لیکن دو مختلف شخصوں کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ہی لفظ کے معنی ضروری نہیں کہ ایک جیسے ہوں۔ اس سے اس روحانی طاقت کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جو کسی خاص شخص کی ہدایت کرتی ہے۔

کاموں بھائی کے معاملے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سائیں بابا کا مرید تھا جس کا آستانہ مہاراشٹر میں' ناسک کے قریب شردی میں واقع ہے۔ علاوہ ازیں سائیں بابا میرے لیے صرف ایک نام تھا جسے میں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسی طرح سے ہندوستان کے اولیاء اور اوتاروں کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کو کہیں منضبط اور مدون نہیں کیا گیا۔ یہ کچھ تو تذکرہ الاولیاء ہے اور کچھ گھریلو داستانوں اور لوگوں میں رائج روایات و عقائد جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ کچھ متفرق دستاویزات ضرور موجود ہیں جو ایسی ازق صورت میں ہیں کہ ایک اناڑی آدمی کیلئے اس کا سمجھنا ناممکن ہے۔

اس دوران جب میں نے سائیں بابا کی تصاویر بازار کے موڑوں پر بکتی اور اپنی روزی میں برکت کی خاطر ڈرائیوروں کو اپنی ٹیکسیوں میں لگائے ہوئے دیکھا تو میں 'شردی کے بزرگ' کو پہچاننے لگ گیا۔ مجھے یہ بھی نظر آیا کہ کاموں بھائی نہ صرف اپنے پیر کی تعلیمات کو اخذ کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کیلئے کوشاں تھا بلکہ ظاہری صورت بھی ان پر ڈھالنے میں لگا ہوا تھا۔ جب کاموں نے خود روحانی طاقت حاصل کر لی تو ان کے مابین یہ مماثلت اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔ سائیں بابا کی تصاویر کے انداز سے پرکھتے ہوئے شردی کے بزرگ کی نمایاں خصوصیات' کاموں کی تین چار روز کی بڑھی ہوئی داڑھی کے بالمقابل باقاعدہ ریش اور ان کے ماتھے پر بندھی ہوئی سفید پٹی یا رومال تھے۔ سر پر باندھے ہوئے اس سفید رومال کی اصل اہمیت اور معنویت کیا تھی' میں نے کبھی معلوم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں اپنی تصویروں میں سائیں بابا اپنے ایک پاؤں کی ایڑی دوسرے پاؤں کے گھٹنے پر ٹکائے ہوئے ایک امتیازی طرز نشست رکھتے تھے۔ سائیں بابا وہ نمونہ تھے جس کے مطابق کاموں اپنے آپ کو ڈھالنے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ جب کاموں نے بابا کا حوالہ دیا تو اس کی مراد شردی کے سائیں بابا سے تھی۔ جو قریبی زمانے میں ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے مانے جاتے تھے اور بلاتفریق مذہب و ملت' بے اندازہ لوگ ان کے حالی موالی تھے۔ میں' جو کچھ کہ دیکھا سنا تھا اس کی بات کرتا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ اور لوگ بھی موجود ہوں جنہیں اسی ذریعے سے روحانی کشف کی قوت ودیعت ہوئی ہو' لیکن میں ان سے واقف نہیں۔

کاموں نے مزید وضاحت کی "بابا ہر چیز مہیا کرتے ہیں۔ میرے اور منی اماں کیلئے۔ روٹی' کپڑا' ہماری کھولی کے کرائے کی رقم' ہر چیز جو ہمارے پاس ہے انہی کی دین ہے" کھانا اور کپڑے یا تو اتفاقیہ طور پر صاحب حیثیت لوگوں کے ہاں سے آ جاتے یا سائیں بابا کی فرمائش پر عنایت

کئے جاتے۔

لیکن کھولی کا کرایہ دینے کیلئے رقم کہاں سے آتی تھی؟ راز جو ہونے کی وجہ سے میں نے کاموں بھائی سے یہ ذاتی سا سوال کرنے پر معذرت خواہانہ انداز میں پوچھا۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں" کاموں بھائی نے بڑی سادگی سے کہا "یہ کچھ اس طرح ہے: ہر ہفتے کے روز کرایہ واجب الادا ہوتا ہے۔ چنانچہ جمعے کی صبح کو، جب میں بیدار ہوتا ہوں بابا مجھے ایک "ہندسہ" کھیلنے کیلئے دیتے ہیں اور میں اس پر شرط لگاتا ہوں، میں اس پر سوا روپے شرط لگاتا ہوں اور شام تک اس ہندسے، پر رقم نکل آتی ہے۔ دوسری صبح میں اپنی جیتی ہوئی رقم حاصل کرتا ہوں، جب کرایہ دار ادھر آتا ہے اسے کرایہ ادا کرتا ہوں اور جو کچھ رقم میرے پاس بچ جاتی ہے اس سے چند ضروری چیزیں خرید لیتا ہوں مثلاً منی اماں کے لیے کپڑے دھونے کا صابن، یا میری بیڑیاں، اس کے ساتھ ہی اس نے کوٹ کی جیب سے ایک بیڑی نکالی اور میری ماں سے پوچھا کہ کیا وہ اسے پی سکتا ہے۔ والد نے جلدی سے سگریٹ کیس سے سگریٹ پیش کیا۔ لیکن کاموں نے اپنی بیڑی کو ترجیح دیتے ہوئے شائستگی سے انکار کر دیا۔

اس قدر آسان! ہر جمعے کو ایک ہندسے، پر شرط لگانا، جو اسی شام تک کامیاب نکل آتے میں کبھی نہ چوکے۔ شرط بدنے والے شخص کیلئے ایک کے بدلے آٹھ کی نسبت سے خالص نفع پیدا کرلے۔ میں، صوفے کی پشت سے تکیہ لگائے ہوئے، بے کیف انداز نشست سے ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے والدین بھی، چہ جائیکہ کہ میری چھوٹی بہن اور بھائی، یہ اندازہ نہیں کر سکے ہوں گے کہ کاموں جو کچھ بتا رہا تھا اس کی کیا خاص اہمیت تھی، لیکن درحقیقت جو تفصیل اس قدر سادگی سے ایک ایسے آدمی کی معرفت بیان کی گئی تھی جو پارسا مشہور تھا، ناقابل یقین تھی۔ "ہندسہ" جس کا حوالہ دیا گیا تھا، بمبئی شہر میں روزانہ، انتہائی ناجائز طور پر، کھیلے جانے والے سب سے بڑے جوئے کا "نقطہ مدار" تھا۔ اس وقت، یہ نیویارک میں کاٹن ایکسچینج (Cotton Exchange) کے آخری نرخ کے سینٹ کا آخری ہندسہ، ہوتا تھا۔ اس ہندسے، کے گرد—— اس جوئے کی میز کی طرح جس کا مرکزی تختہ گھومتا ہے،—— ہر روز ایک جوا کھیلا جاتا تھا جو کروڑوں تک پہنچتا تھا۔ کیا آسودہ حال اور امیر کبیر سیٹھیئے اور کیا معمولی تنخواہ دار ملازم اور گھریلو نوکر ہر روز اس پر داؤں لگاتے، سوائے اتوار اور عام تعطیلات کے جب نیویارک کاٹن ایکسچینج بند کر دیا جاتا۔

ایک بھاؤ کھلنے، ___ اور ایک بھاؤ 'بند' ہونے کی رقم ہوتی تھی، دونوں صورتوں میں سینٹ (امریکی سکے) کی رقم کا آخری ہندسہ ہوتا جس پر جوئے کا دارومدار تھا۔ اصل جوا، ہر روز 'بند' بھاؤ کے آخری ہندسے پر ہوتا تھا۔ شرط کی باہمی نسبت، ایک کے بدلے آٹھ ہوتی تھی۔ سارا

کاروبار غیر قانونی تھا لیکن اس قدر وسیع پیمانے پر چلایا جا رہا تھا کہ اسے پولیس کی عملی چشم پوشی سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس پہلو سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ اس منحنی سے آدمی کو ہر ہفتے ایک ہندسہ بتایا جاتا تھا جو بلا تاخیر' باقاعدگی کے ساتھ صحیح نکلتا تھا اور پھر بھی اس ہیبت ناک قوت کو صرف اس لئے استعمال کر رہا تھا کہ بمبئی کے انتہائی پسماندہ علاقے میں واقع ایک کمرے کی کھولی کا کرایہ ادا کرے۔ یہ ایسی قوت تھی جو ایک کنگال کو ایک ہفتے کے عرصے میں کروڑ پتی بنا سکتی تھی۔ ہوش و حواس اڑا دینے والی بات۔ میں نے سوچا' لیکن ایسی قوت کاموں جیسے شخص کے علاوہ کسی دوسرے کو ودیعت نہیں کی جاتی جسے اس بات کا عادی بنا دیا گیا تھا کہ وہ اسے صرف معمولی مقصد براری کیلئے ہی استعمال میں لائے جس کے لئے یہ اسے عطا ہوئی تھی۔۔1

جب کہ ہم کاموں سے مصروف گفتگو تھے وہ دلجمعی کے ساتھ بیڑی پیتا رہا جس کی تیز بدبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اسے ہندوستان کے دیہاتیوں کی طرح' بیڑی کو لبوں سے لگائے بغیر' دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے انہیں جوڑ کر پیتا تھا۔ اس کی وضع قطع' اس کی گفتگو' اس کی شکل ایک بہت ہی معمولی آدمی سے قطعی مختلف نہیں تھی جس کی ایک پرہجوم بازار میں حقیر موجودگی کا کبھی کسی کو احساس بھی نہ ہوتا۔

تھوڑی دیر کے بعد گفتگو میں ایک واضح تعطل پیدا ہو گیا اور پھر کمرے کے گھریلو ماحول پر مکمل سکوت چھا گیا۔ سب کی نظریں کاموں بھائی پر مرکوز تھیں کیونکہ اس کی آنکھوں میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی چیز پر جمی ہوئی چمک رہی تھیں۔ وہ کوئی چیز نگلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسی وقت اسے پے در پے دو ہچکیاں آئیں جنہیں وہ دبانے کی سعی کر رہا تھا۔ میرے چچا نے میری والدہ کو اشارہ کیا یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ ہمیں جس لمحے کا انتظار تھا وہ آنے والا تھا۔

چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آ پہنچا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان جلتی ہوئی بیڑی کو مسل دیا اور اسے آہستگی سے فرش پر گرا دیا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔۔ یہ وہ لاغر' منحنی آدمی نہیں تھا جسے میرے چچا ہمراہ لائے تھے۔ اس نے اپنے ادھر ادھر نظر دوڑائی یہ دیکھنے کیلئے کہ اس کے ارد گرد کون کون بیٹھا تھا۔ ہم بھی اپنی اپنی جگہ ست انداز نشست بدل کر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اس انتظار میں کہ وہ آگے کیا کرتا ہے۔ کمرے میں ہو کا عالم تھا۔ پھر ایک ایسی آواز میں جس کا زور' جس کی نوا اور لب و لہجہ کاموں کے قائم لہجے سے بہت مختلف تھا' اس روح مجرد نے جو کاموں کے لاغر جسم پر حاوی ہو چکی تھی' عربی زبان میں دعا پڑھنی شروع کی' جس کے معنی سوائے ایک لفظ اللہ' کے میرے لئے ناقابل فہم تھے۔ جب میں

نے اسے پہلی مرتبہ سنا تو اس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں لرزہ کی لہر دوڑا دی۔

ہمیں احساس تھا کہ وہ ہمارے گھر میں دعا مانگ رہا تھا اور ہم سب پوری طرح مودب و متوجہ اپنے سروں کو جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میری ماں نے اظہار احترام کی خاطر اپنے سر کو ساڑھی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔ تاہم کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے کون سی مخصوص دعا پڑھی تھی؟ ہمارا خیال تھا کہ وہ روح جس نے کاموں پر قابو پا لیا تھا اس کے اپنے گرو۔۔۔ سائیں بابا۔۔۔ کی تھی لیکن شردھی کے اس ولی کی کسی تصویر سے' جنہیں میں نے بعد میں دیکھا' اس طاقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوا جس کو اس سہ پہر برقائے ہوئے کاموں کے اندر ہم نے ضوفگن ہوتے مشاہدہ کیا تھا۔

اپنی دعائیں خوش الحانی سے پڑھ کر ختم کر لینے کے بعد اس نے میرے والد کو آواز دی۔ "فرامجی" اس نے میرے والد کے نام کا پہلا لفظ استعمال کیا "ہاں جی!" میرے والد نے اس کا فوراً مودبانہ جواب دیا۔

"تمہیں کس بات کی فکر ہے؟" میرے والد کو' خود اعتمادی کی کمی پر ملامت کرتے ہوئے ایک آواز کمرے میں گونجی۔

اس وقت معاملہ یہ تھا کہ میرے والد گورنمنٹ کی ملازمت ختم کر چکے تھے اور پنشن لینے کے بعد اپنے آپ کو تنہا اور بے چین پا رہے تھے۔ گورنمنٹ کے قوانین آدمی کو ایک خاص عمر میں فراغت پانے کے متقاضی تھے۔

"یہاں آؤ"___ آواز آئی۔ والد صاحب اپنے پڑھنے کی میز کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس آدمی کی طرف بڑھے جو ہمارے لئے اب بھی کاموں بھائی تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ" آواز نے حکم دیا۔ اس نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کیا۔ والد صاحب اچھے خاصے تنومند اور جسے والے' اندازاً" پانچ فٹ نو انچ قد اور تقریباً دو سو پونڈ وزن رکھتے تھے۔ ان کیلئے کاموں بھائی کی گود یا اس کی رانوں پر بیٹھنا گویا اسے کچل دینا تھا۔ اور نہیں تو اس (وزن) سے ایک آدھ ہڈی تو یقیناً ٹوٹ جاتی۔ والد صاحب قدرتی طور پر جھجک رہے تھے۔ "بیٹھ جاؤ" زور دار آواز نے اصرار کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا "تم کس لئے خائف ہو؟" "ہاں جی؟" والد نے دھیمے سے کہا اور جس طرح حکم ملا تھا' عمل کیا۔ والد صاحب نے ہمیں بعد میں بتایا کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو ہاتھ ان کے کندھوں کو گرفت کئے ہوئے تھے وہ کتنے طاقتور تھے جبکہ وہ آواز مزید دعاؤں کی تلاوت کر رہی تھی۔ والد کے دونوں بازوؤں پر' شانوں سے لیکر انگلیوں تک' آہستہ آہستہ مالش کی گئی جبکہ دعاؤں کا ورد تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اس کی توجیہ ہمیں بعد میں معلوم ہوئی کہ والد صاحب کو فالج کا خوف تھا جو میرے دادا کو ہو

چکا تھا اور والد صاحب کے جسم کا یہی حصہ تھا جس پر آواز اپنی کرامات ودیعت کر رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ والد کے سر پر رکھ کر دعا دی اور ان کی پیٹھ تھپک کر کہا "جاؤ' کوئی خوف نہ کھاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا"۔ والد ان الفاظ کے معانی ہم سے زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے دلی خوف سے آگاہ تھے۔

میری والدہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس نے ایک مناجات کی اور ان کے لیے برکت مانگی۔ اس کے سامنے وہ محض سر جھکائے ہوئے کھڑی رہیں۔ ان کو مخاطب کر کے اس نے کہا "آپ خود ہی دعائیں مانگتی ہیں اور خدا انہیں سنتا ہے۔ مجھے آپ کیلئے اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

پھر میری باری آئی کیونکہ میں اپنے والدین کی تینوں اولادوں میں سے بڑا تھا۔ اس نے مجھے میرے خاندانی لاڈ کے مشہور نام سے پکارا نہ کہ میرے عام نام سے جیسا کہ میں اس سے توقع رکھتا تھا۔

"تمہارا اس چیز سے کیا سروکار ہے جو تمہاری جیب میں پڑی ہے" اس نے اچانک مجھ سے دریافت کیا۔

"کون سی چیز؟" میں نے پوچھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی مراد کس چیز سے تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پشت کی طرف کر لیا۔ یہ بتانے کیلئے کہ اس کا اشارہ میری کولہے والی جیب سے تھا۔ جس میں' میں اپنا بٹوہ رکھتا تھا۔ اس سے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں محو حیرت تھا۔

"وہ چھوٹا سا گنڈا جسے تم اس قدر حفاظت سے رکھتے ہو گویا اس سے فرق پڑے گا" اس نے کہا اس وقت مجھے پورا اندازہ ہوا کہ اس کا کیا مقصد تھا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے متعلق دنیا میں صرف تین شخصوں کو علم تھا۔ ایک وہ ہندو پروہت جس نے اس کو میرے سپرد کرنے سے پہلے پوجا کی تھی۔ دوسرا ایک پارسی دوست جو اس پروہت کو اس وقت میرے پاس لایا تھا جب کوئی بات بھی ڈھنگ سے سرانجام نہیں پا رہی تھی اور تیسرا شخص میں خود تھا۔ یہ ایک ایسا ذاتی معاملہ تھا کہ میں اس کو کسی سے بیان کرتے ہوئے بھی گھبراتا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کے لمحے سے لیکر کسی نے دیکھا تک نہیں تھا۔ یہ سیدھا میرے بٹوے میں چلا گیا تھا اور میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اس نے اس کا حوالہ محض اس لئے دیا تھا کہ مجھے اس کی قوت ادراک کی جھلک مل جائے۔ میرا ہاتھ بے اختیار میری عقبی جیب کی طرف اٹھ گیا اور میں نے پوچھا "آپ نہیں چاہتے کہ میں اسے اپنے پاس رکھوں؟"

"کوئی بات نہیں" اس نے جواب دیا "تم اسے رکھے رہو' یہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔ پھر اس نے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اسے

اپنے دل کے ساتھ دبایا۔ اپنے سیدھے ہاتھ کو اس نے میرے تمام سر اور دونوں شانوں پر پھیرا‘ ہمہ وقت ایک دبی آواز سے مناجات کرتے ہوئے۔ پھر اس نے میرے داہنے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور میرے انگوٹھے اور انگشت شہادت کی درمیانی قوس کے پیچھے کو دبایا۔ پوری سختی کے ساتھ‘ اتنا کہ وہ دکھنے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس سے کیا مراد تھی اس کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ بوجہ میرے مصنف ہونے کے‘ وہ مجھے اس ہاتھ کیلئے قوت بخش رہا تھا جو قلمبند کرتا ہے۔

اس نے ہمارے گھر میں‘ اولین روز ہم میں سے ہر ایک کیلئے خیر و برکت مانگی‘ ہر ایک سے باری باری گفتگو کی‘ جس کے اختتام پر ’روح‘ بولی ”اب نماز کا وقت ہو گیا ہے اور مجھے اب آپ سے رخصت ہونا چاہیے“___ اور ایک مرتبہ پھر عربی زبان میں مناجات کے الفاظ پڑھتے ہوئے وہ روح‘ ہمارے سامنے سے سبک حرکت کے ساتھ گویا اڑ گئی۔ اسی کرسی پر‘ ایک مرجھلے‘ ادھ موئے کاموں بھائی کو چھوڑ کر جو پھر ہوش میں آنے کیلئے سعی کر رہا تھا۔

جیسا کہ میرے چچا نے سمجھایا تھا‘ کاموں بھائی کو فوراً گرم چائے کا ایک پیالہ دیا گیا اور وہ سنبھل گیا۔ پھر اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ کمزور آواز والا مسکین منحنی سا آدمی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کاموں بھائی کو ہوش میں آنے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ اس پر کیا بیتی تھی۔ ہمارے لیے‘ جنہوں نے ایک مافوق الفطرت عجوبہ دیکھا تھا یہ مشکل تھا کہ ہم حسب معمول گفتگو کا اعادہ کرتے۔ تاہم‘ جلد ہی کاموں بھائی کو خود بھی گھر لوٹنا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ اسے کون سے نمبر کی بس لینی چاہیے۔ ایک روح مجرد بس کے ذریعے گھر جا رہی تھی۔

اس وقت تک‘ میں بھی قدرے جتلا لیکن بے حد گھبرایا ہوا‘ دلچسپی رکھنے والا ہو چلا تھا۔

حاشیہ

۱۔ یہاں جناب امیر علیہ السلام کے ایک خطبے کا اقتباس پڑھیے جو آپ نے دنیا کے متعلق فرمایا ہے۔
”بتحقیق کہ مومن دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس میں سے وہ اتنا ہی لیتا ہے کہ جس سے اس کا اضطرار و احتیاج دور ہو۔

(مترجم۔ نہج البلاغہ)

چوتھا باب

انوکھا خواب

کئی سال بعد، جب بمبئی کے اسی وزیر اعلیٰ، جو مرار جی ڈیسائی تھے، کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ میرے پاسپورٹ کے بارے میں ان کا انداز اس قدر کینہ ورانہ کیوں تھا؟ ڈیسائی صاحب نے بڑے وثوق سے کہا کہ (اس مقابلہ میں) انہوں نے تو صرف مسٹر نہرو کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ اس معاملہ کی چھان بین نہیں کی۔ تاہم اس بات کا جاننا انتہائی تکلیف دہ ہوتا کہ ہندوستان کے دو لیڈروں، وزیر اعظم مسٹر نہرو یا مرار جی ڈیسائی جو بعد میں ان کے وزیر مالیات بنے، دونوں میں سے کس نے جھوٹ بولا۔

آخر کار جس طریقہ سے میرا پاسپورٹ واپس کیا گیا وہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ مسٹر نہرو کی بہن مسز پنڈت کا نام اقوام متحدہ کی صدارت کیلئے تجویز کیا جانا تھا۔ ہندوستان کی حکومت بڑی تندہی سے اس الیکشن کیلئے سفارتی سطح پر زمین ہموار کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں اتفاقاً" ہندوستان کی پارلیمنٹ کے چھ ممبروں نے متحدہ طور پر میرے پاسپورٹ کی ضبطی کے متعلق ایک سوال پوچھ لیا۔ اس کا برق سا اثر ہوا۔ ایسے موقع پر مخالف پراپیگنڈا کے سدباب کیلئے میرے پاسپورٹ کی واپسی کا فوری حکم صادر کیا گیا۔ یوم آزادی کی صبح پندرہ اگست 1953ء کو، جبکہ تمام ہندوستان میں عام تعطیل تھی، ایک سرکاری افسر بہ نفس نفیس مجھے پاسپورٹ کی بازیابی کی خبر دینے آیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اسے حکم ہے کہ اگرچہ آج عظیم قومی دن کی تعطیل ہے مگر مجھے نیا پاسپورٹ جاری کرنے کیلئے پاسپورٹ کے مقامی دفتر کو کھلوایا جا سکتا ہے۔ میں نے اطمینان سے کہا "ایسی کوئی جلدی نہیں" ___ نتیجہ میرے حسب منشاء برآمد ہو چکا"

انہی دنوں جبکہ میں کشمکش حیات کے مشکل ترین دور میں تھا اور مالی طور پر انتہائی بدحال، میں نے ایک عجیب خواب دیکھا --- میرے ایک چچا، جن سے مجھے بچپن سے قلبی لگاؤ تھا اور جو انڈین میڈیکل سروس کے ریٹائرڈ کرنل تھے، سخت بیمار تھے۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں امتیازی

خدمات کے D.S.O تمغہ یافتہ تھے۔ یہ وہ فوجی اعزاز تھا جو انگریز حکومت ایسے ہی دان نہیں کر دیتی تھی...... ایک خاموش طبع، کم آمیز انسان، وہ ایک ایسے سرجن تھے جن کا نام آزادی سے قبل لاہور میں روایت کے طور پر شہرت رکھتا تھا۔

میں بہت مغموم تھا کہ ایک ایسی زندگی جو اپنے ہم جنسوں کی مسیحائی کیلئے وقف تھی، معدوم ہو رہی تھی۔ انہیں دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ چند گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کی سب سے بڑی صاحبزادی دہلی سے بعجلت بذریعہ ہوائی جہاز آرہی تھی اور میں نے رات گئے اسے ہوائی اڈہ سے لا کر، اپنے باپ کے پاس چھوڑنے کی ذمہ داری لی تھی۔ اس فرض کو سرانجام دیکر میں صبح دو بجے واپس گھر آیا اور سو گیا۔ میرے چچا اس دل کی بیماری سے جانبر ہو گئے اور مزید سترہ سال جیے لیکن یہ تو کہانی کا ضمنی حصہ ہے......

اس فجر کے ابتدائی اوقات میں، میں نے ایک ایسا انوکھا خواب دیکھا جو طولانی، تسلسل لیے ہوئے، غیر معمولی اور ایسے ماحول میں نظر آیا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ مجھے پہلے بھی خواب آتے رہے ہیں لیکن اس ایک جیسا جو 6 اپریل 1954ء کی علی الصبح دیکھا--- کوئی بھی نہیں تھا۔

میں عالم خواب میں ایک دوست کے ساتھ ایک تنگ گلی میں چل رہا تھا۔ وہ کوئی پرانی سی گلی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ ایسی ہی گلی میں نے نظام حیدر آباد کے چو محلہ محلات کے قرب و جوار میں دیکھی تھی، لیکن یہ بالکل ویسی نہیں تھی۔ اس کی سطح کچی تھی جس کی مٹی بھوری خاک آلود تھی۔ اس میں بڑے غریب لوگ چل پھر رہے تھے۔ میں جس دوست کے ساتھ تھا وہ حسین نامی ایک مسلمان تھا جس کا تعلق خوجہ فرقہ سے تھا۔ اس نے سفید براق سوتی کاٹن کی پتلون پر شوخ نیلے رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میں اس کے پہلو میں، عام دنوں کے لباس، آدھی آستین کی سفید قمیض پہنے ہوئے چل رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کپڑوں کی خواب میں کوئی خاص نوعیت تھی لیکن ان کپڑوں کے رنگ اور خوبی کے ادراک کے ساتھ خواب شروع ہوا۔ میں ان تفصیلات کو اس لیے بیان کر رہا ہوں کیونکہ میرے تجربے نے ثابت کیا ہے کہ بعض اوقات تفصیلات جو ابتدا" معمولی نوعیت کی حامل معلوم ہوتی ہیں بعد میں کچھ معنویت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

میرا دوست (حسین) اور میں خوش دلی کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ ہمارے گردوپیش لوگ راستے پر بھیڑ کئے ہوئے تھے، جس سے ہماری رفتار دھیمی پڑ گئی تھی---- وہ لوگ، تمام مرد، اسی ایک سمت کی طرف چل رہے تھے جدھر ہم جا رہے تھے۔ یہ بات کہ وہ انتہائی غریب تھے ان کھردرے، میلے کپڑوں سے عیاں تھی جو وہ پہنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہمیں احساس سا ہوا کہ کوئی اہم شخصیت ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ مجمع میں ایک طرح کا ہلکا شور تھا۔ وہاں دھکم پیل تھی' حسین اور میں ایک طرف ہو گئے۔۔۔ ہمارا رد عمل گویا یہ تھا کہ ہم اپنے پیچھے آنے والے اہم شخص کو راستہ دے دیں تاکہ وہ گزر جائے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ کون تھا؟

خواب کے اس مقام پر (میرا دوست) حسین غائب ہو گیا۔ میری توجہ پیش منظر کی طرف مبذول ہو گئی۔ مجھ سے آگے ہر شخص عبادت میں جھکا ہوا تھا۔ جونہی یہ آدمی نزدیک آیا' لوگوں نے اس کی حد درجہ تعظیم کی' اس سے زیادہ جو ایک بشر کیلئے کی جاتی ہے۔ اجسام کا ایک سمندر تھا جو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا' خشوع میں جسم دہرے ہو کر سرنگوں' جن کی پیشانیاں بھوری مٹی کو چھو رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے' ان کے سر اسی خاکستری موٹے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے جو وہ پہنے ہوئے تھے۔

یکایک روشنی کی ایک شعاع اس سربسجود مجمع پر پڑی گویا آسمان شگافتہ ہو گئے تھے تاکہ یہ روشنی گزر جائے۔ وہ روشنی تیز تر ہوتی گئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی' جب وہ روشنی جھکے ہوئے اجسام پر گردش کرنے لگی۔ جیسے جیسے روشنی گھومتی' اجسام لرزنے لگتے۔

ایک لمحے کے بعد میں نے ان آدمیوں کی' جو زمین پر سکڑے سمٹے پڑے تھے' گہری' اثر انگیز ٹھنڈی آہیں سنیں اور بعدہ ایسے الفاظ سنے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔۔۔ "**حضرت علیؑ۔۔۔ حضرت علیؑ**"____ ان کی گہری آہیں ظاہر کرتی تھیں گویا انہیں درد سے نجات مل گئی ہو۔

روشنی آگے ہی بڑھتی رہی حتیٰ کہ وہ اس جگہ آ گئی جہاں میں کھڑا تھا۔ یہ روشنی ایک قوی الجثہ شخص کے آگے آگے رواں تھی۔ وہ دائیں طرف' ایک احاطہ کی طرف مڑ رہے تھے جو چٹائیوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک تنگ شگاف تھا۔ میں اس کے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ایک طرح کا احساس تھا کہ کوئی متبرک جگہ تھی۔ جونہی وہ شگاف کے قریب پہنچے انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا تاکہ اس بانس کو پکڑ رکھیں جس کے ساتھ چٹائی باندھی گئی تھی۔ وہ ارادتاً" ایک دستی بنائے ہوئے' پایاب' مٹی کے پشتے پر ٹہلتے چلے گئے جس کے ساتھ پانی کی تنگ سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ ایک اور ایسی تفصیل تھی جو خواب میں واضح طور پر دکھائی دی۔ یہ بات عجیب لگی کہ وہ شخص' اتنی چھوٹی سی آڑ کو اتنی احتیاط سے عبور کر رہا تھا۔

اس کی جچی تلی کارروائی کی وجہ سے مجھے وقت مل گیا کہ میں اس کے طاقت ور بازوؤں پر غور کر سکوں جو اس کے آدھی آستین والے چغے سے دکھائی دے رہے تھے' وہ ایک پہلوان سا

کے بازو تھے۔ وہ سراپا قوت تھا۔ جو لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ ڈھیلا چست تھا۔ اس کا رنگ نسواری تھا اور اس کے اوپر چھدرا چھدرا سا زردوزی کام کیا ہوا تھا جس طرح کہ شاندار نرگسی محراب ہو۔ وہ قدیم رومی سپاہی کے آدھے آستین والے چھوٹے چست کوٹ سے مشابہت رکھتا تھا۔ ایک بٹی ہوئی سنہری ریشمی ڈوری' جو زردوزی کے پھولدار کام سے مماثلت رکھتی تھی' اس کی کمر میں بندھی ہوئی تھی جس کے کھلے سرے اس کے پہلو میں لٹک رہے تھے۔ اس کے سر پر عجیب سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جس کی پشت پر ایک کپڑا لٹک رہا تھا جو اس کی گردن کے پچھلے حصے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ لہٰذا اس کے بال پچھلی طرف سے نظر نہ آتے تھے۔ اس کی ٹانگیں مضبوط اور گٹھیلی تھیں۔ اس کا رنگ روپ ایک خوبصورت عرب کی طرح گندمی تھا۔

چٹائیوں کے اندر بنے ہوئے شگاف سے وہ اندر چلا گیا' ایک انسان جس کا نام مجھے صرف اس وقت ان لوگوں کی اطمینان بھری گہری سانسوں سے معلوم ہوا جب وہ اس کے آگے فرط تعظیم و تکریم سے جھکے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ حضرت کے معنی ولی ہوتے ہیں اور علیؑ ظاہر ہے اس کا اپنا نام تھا لیکن میں نے اس سے قبل کسی شخص کی زبانی یہ نام نہیں سنا تھا۔

کچھ توقف ہوا۔ اتنا ہی کہ اسے اپنی عبادت کرنے کے لئے وقت مل جائے۔ تاہم ایسا کوئی عینی مشاہدہ نہیں تھا کہ وہ عبادت کر رہے ہوں۔ یہ ایک طرح کا احساس تھا جو کسی کو وہاں ہونے والے واقعات سے پیدا ہوتا تھا۔ میں چٹائیوں کے پار کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ نہ اسے چار دیواری کے اندر جانے کے بعد دیکھ سکتا تھا۔ عالم خواب میں وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ احساس تھا گویا کچھ وقت گزر گیا ہو۔ اب میں گلی کے انتہائی سرے پر' اپنے گرد گھومتے پھرتے ہوئے نامانوس لوگوں میں تن تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک شعاع نور پھر نمودار ہوئی۔ یہ چٹائیوں میں بنے ہوئے شگاف (درز) میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آگے بڑھنے لگی۔ لوگ جلدی سے پھر اس قدر جھک گئے کہ ان کی پیشانیاں زمین کو چھونے لگیں۔ وہ پہلے کی طرح اسی مقدس ہستی کی موجودگی سے باخبر معلوم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ شعاع نور ان کی جھکی ہوئی پشتوں پر پڑنے لگی اور ان زمین بوس اجسام سے پھر ایک اطمینان کی گہری سانس ابھری۔ یہ اطمینان کی گہری سانس گویا زمین میں سے نکلتی محسوس ہوتی تھی اور پھر' ایک گہری طمانیت آمیز آہ سرد کے ساتھ وہی نام جلدی سے پھر پکارا گیا' پہلے کی طرح دو مرتبہ "حضرت علیؑ"۔ حضرت علیؑ"۔ اس کے لئے ایک آرزو ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ آرزو انگیز گہری سانس میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

اس شگاف کے در پر وہ مقدس ہستی کھڑی تھی۔ ہمارے درمیان گلی میں سجدہ ریز لوگوں کے اجسام پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ اس کے عمامے کے ساتھ لٹکتے پتلی ململ کے ایک چھوٹے

سے ٹکڑے سے ڈھانپا ہوا تھا جس طرح اس کی گردن نظروں سے اوجھل تھی اسی طرح اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کپڑے کو ایک طرف سرکایا' تاکہ اپنا چہرہ مجھ پر آشکارا کرے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا ماسوائے ایک خیرہ کن روشنی کے۔ یہ ایسا ہی تھا جس طرح سورج کو دیکھ لیا جائے۔ میں اپنی جگہ جما رہا۔ میں نے اپنی نگاہ شوق اس کے کھلے چہرے پر جما دی۔ تب میں نے اسے واضح طور پر دیکھ لیا۔ یہ ایک تیس سال سے متجاوز عمر یا اوائل چالیس سالہ عمر کے سے شخص کا چہرہ تھا۔ اس کی ریش (مبارک) سیاہ تھی جو اطراف سے سنواری ہوئی اور نوکیلی تھی اگرچہ ٹھوڑی پر تیز نوکیلی نہیں تھی۔ اس نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ پھر اس نے اپنا سیدھا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہمارے درمیان فاصلہ ایک ہاتھ سے بڑھ کر تھا لیکن جونہی میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھامنے کیلئے کوشش کی یہ فاصلہ کسی طرح گھٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ساکن اجسام' جو تعظیم میں جھکے ہوئے تھے' گویا مجھے راستہ دینے کیلئے بیچ سے جدا ہو گئے تھے۔ اب ہمارے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس عجوبہ شخص اور مظہر قدرت سے متحیر ہو کر میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا' تب ایک ہلکے' شفقت آمیز جھٹکے سے اس نے مجھے اپنے آگے سے کھسکا کر اپنی دائیں طرف کر لیا۔ میں لطیف ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ...... میں بیدار ہو گیا۔ میری نبض (عالم جوش میں) میرے گلے میں پھڑک رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میری سانس پھول گئی تھی اور میرا پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے تاریکی میں ہی اپنے آپ کو سنبھالا' پھر اپنا ٹیبل لیمپ جلایا۔ میری بیوی نے دریافت کیا کہ کیا میں ٹھیک ٹھاک تھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "لیکن میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے"۔

"مجھے صبح اس کے بارے میں بتانا" میری بیوی نے کہا' پہلو بدلا اور پھر سو گئی۔

میں سیدھا ہو بیٹھا اور ایک سگریٹ سلگایا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے خواب کو دہرایا تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ میں اس کا کوئی جز بھول نہ جاؤں۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ میں نے ایک انوکھے شخص کا ادراک حاصل کیا تھا۔ لیکن میں اس کے مقصد سے بے بہرہ تھا۔ جس چیز نے مجھے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ خواب میں آنے والے شخص کا نام نامی تھا۔ جو دونوں مواقع پر دل کی گہرائیوں سے پکارا گیا تھا۔ میں صبح کی آمد کا منتظر تھا۔ میں مسلسل سگریٹ پیتا رہا حتیٰ کہ سورج نکل آیا۔ ابھی کافی سویرا تھا کہ کسی کو بے آرام کیا جائے۔ میں سونا مائی سے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا خواہش مند تھا۔

اس صبح کو سات بجے سے لیکر میں چائے کے کئی پیالے پی چکا تھا۔ سگریٹ اور چائے پینے

کا مقصد اپنے اندرونی اعصابی تناؤ پر قابو پانا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وقت جلدی کٹ جائے تاکہ میں اپنا خواب طمی سے بیان کر سکوں جو آگے اسے سونامائی کے گوش گزار کرے۔

میں اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی کلائی کی گھڑی کو بار بار دیکھتا رہا۔ پونے آٹھ بجے میں نے ٹیلی فون کا چونگا (آواز گیر) اٹھایا اور یہ خیال کر کے سونامائی کا نمبر ڈائل کیا کہ اس کے گھر میں کوئی تو بیدار ہو چکا ہو گا۔ سونامائی عموماً خود ٹیلی فون نہیں اٹھاتی تھی۔ لیکن اس صبح کو اسی نے اٹھایا۔ اس کی آواز سنتے ہی میں گم سم ہو گیا۔ پھر میں بول پڑا "مائی' یہ دوسو بول رہا ہے"۔

"ہاں' بیٹے" اس نے تسلی کے ساتھ جواب دیا "مجھے بتاؤ"۔

کیا وہ پہلے سے جانتی تھی کہ میں نے اسے اس صبح کو اتنی سویرے کس لیے فون کیا تھا؟ اس کی آواز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے میرے فون کرنے کا مقصد معلوم کرنے کی کوئی جلدی تھی۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے' میں اس کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ مجھے افسوس ہے میں نے اتنی سویرے آپ کو فون کیا"۔

"مجھے بتاؤ" اس نے جواباً پھر تحمل سے کہا "تمہیں کیسا خواب آیا؟"

میں نے اسے بتایا۔ پوری جزئیات کے ساتھ۔ حتیٰ کہ میں موقع تک کہہ چکا جب پہلی دفعہ لوگ خواب میں آہستہ آہستہ پکار رہے تھے "حضرت علیؑ۔ حضرت علیؑ"۔ یہ سنتے ہی سونامائی پرمسرت آواز میں بول اٹھی "باوا تمہارے پاس آ گئے"۔

"میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ شخص' جو مجھے خواب میں ملا ہے' کون تھا؟"

"وہ؟" وہ کھنکھناتی ہنسی کے ساتھ لہک کر کہنے لگی "نادان لڑکے' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سالہا سال تک تم کس کی پرستش کرتے رہے ہو؟"

"لیکن مائی ہم ہمیشہ انہیں 'مشکل آسان صاحب' پکارتے چلے آئے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ ہمیں اسی طرح ان کا نام لینا سکھایا ہے"۔

"مشکل آسان صاحب' مولا علیؑ' حضرت علیؑ' یہ سب ایک ہی ہیں۔ اس ہستی نے پسند فرمایا کہ تم پر بطور حضرت علیؑ ظاہر ہوں۔ لیکن اب تم مجھے پورا خواب سناؤ" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا' اس نقطہ اختتام تک جب انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے آگے کھینچ لیا"۔

"تم نہیں جانتے کہ تم کتنے بانصیب ہو" مائی نے کہا "فی الحال اپنے خواب کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا"۔

"کیا اپنی بیوی سے بھی نہیں؟"

"البتہ تم اسے بتا سکتے ہو لیکن باقی سب کو نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہیں خود بخود پتہ چل جائے گا کہ تم اس کا تذکرہ کر سکتے ہو۔ اس وقت تم جس کسی کو بھی چاہو اس کے متعلق بتا سکو گے۔ اور میں تم سے آج ہی ملنا چاہتی ہوں۔ میں اس کا پورا ذکر پھر سننا چاہتی ہوں۔ میں اس شخص کو دیکھنا چاہتی ہوں جس کو میرے مولا علیؑ نے زیارت سے فیض یاب فرمایا ہے"۔

میں جانتا تھا کہ 'حضرت' ولی کو کہتے ہیں۔ 'مولا'___ مائی نے بتایا کہ پیشوائے دین کو کہتے ہیں۔ انہوں نے اسے بطور مولا علیؑ زیارت سے بہرہ ور کیا تھا "لوگ انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں لیکن یہ وہی علیؑ ہیں' بعض لوگوں کے نزدیک وہ حضرت محمدؐ خاتم النبین (صلعم) کے بعد اسلام میں سب سے برگزیدہ ہستی ہیں"___ اس کے ساتھ ہی خاتون نے ٹیلی فون بند کر دیا اور میرے لئے معاملہ پہلے سے زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ اس ساری بات کی کیا اہمیت تھی؟

حضرت علیؑ نے اپنے مقلدین پر واضح کر دیا تھا کہ وہ خدا نہیں ہیں۔ جب ان کے مقلدین میں سے کچھ نے ان کی نافرمانی کی اور اصرار کیا کہ وہ ہیں تو انہوں نے ایسا کہنے والوں کو ملحد قرار دیا تھا۔ جب وہ اس بات پر اڑے رہے تو انہوں نے اپنی ذوالفقار کو بے نیام کیا اور ان ملحدین کے سر اڑا دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ گیارہ آدمیوں نے ان کی نافرمانی کی تھی اور گیارہ سر کاٹ دیئے گئے۔ لیکن یہ سب باتیں' میں نے کئی سالوں بعد سنیں جب دھیرے دھیرے ان کے بارے میں تفصیلات مجھ تک پہنچتی رہیں۔

میں نے تفصیلات کی تفتیش نہیں کی۔ میں محض اس مثالی پیکر' اس شبیہ سے وابستہ رہا جسے میں دیکھ چکا تھا اور اس اعتقاد پر جما رہا جو اس کے طفیل مجھے حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؑ خدا نہیں ہیں لیکن میرے لئے' جو کئی سالوں سے ان کی تقلید میں محو رہا' اگرچہ میں ایک پارسی ہوں اور مسلمان نہیں ہوں' وہ میرے لئے ایک طرز حیات ہیں اور میں نے جونہی اس کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کی تو مجھے پورا اندازہ ہو گیا کہ وہ عین دین ہیں۔ کون سا دین؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ جہاں بعض مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ اسلام کی روح ہیں' وہ میرے لئے کل دین ہیں۔

بعد میں' اسی روز میں نے سونا مائی سے ملاقات کی تاکہ اسے اپنا خواب ایک مرتبہ پھر سنا سکوں۔ وہ بے حد خوش تھی۔

مجھے اپنے خواب کی تعبیرات (کے معانی) کو سمجھنے میں کافی طویل عرصہ لگا بلکہ کچھ زیادہ ہی' تاکہ میں اس مضبوط محافظ ہاتھ کی گرفت سے حاصل شدہ قوت کے مکمل اثر پر صدق دل سے یقین کر سکوں۔

سوناماتی نے مجھے کہا تھا کہ میں خواب کی جزئیات کو لکھ لوں اور انہیں بحفاظت اپنے پاس رکھوں۔ پہلے پہل یہ ضروری معلوم ہوا تھا لیکن جب اس کے بعد میں انہیں سالوں سرسری انداز میں دہراتا رہا تو وہ میری زندگی کا ایسا جز بن گئیں کہ میں انہیں کسی طرح نہ بھلا سکتا تھا۔ وہ گلی' میرے گرد و پیش چلتے پھرتے لوگ جو بعد میں تعظیماً" جھک گئے تھے' جس انداز میں حضرت علیؑ نے بالارادہ آہستہ خرامی فرمائی تھی۔ ان کا سُنواری رنگ کا عربی لباس جس کے اوپر باریک زردوزی کا کام کیا ہوا تھا' وہ دمکتی روشنی کی شعاع جو ان کے آگے آگے رواں تھی' ان کا روئے مبارک جو انہوں نے مجھے دکھانے کیلئے بے نقاب فرمایا اور آخر میں جس انداز سے انہوں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

بحیثیت ایک پارسی کے' یہ خواب میرے مذہب کیلئے--- انمیل تھا۔ لیکن خواب میں تبدیلی مذہب کا کوئی کنایہ نہیں تھا' نہ ہی اس میں کوئی ایسی بات تھی جو مذہب پر دلالت کرتی ہو۔ یہ میری ایک ایسے بندہ خدا سے پہلی ملاقات تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' جسے کبھی جانتا نہ تھا' جس کے متعلق کبھی سنا نہ تھا۔ یہ بات کہ وہ شیعوں کے نزدیک اسلام کے پہلے خلیفہ ہونے کے حق دار تھے لیکن سینوں کے مطابق چوتھے خلیفہ تھے' ضمنی تھی۔ جیسا کہ یہ حقیقت بھی کہ حضرت محمد (صلعم) کے بعد وہ اس دین کے سب سے اہم ترین فرد تھے۔ وہ حضرت محمد (صلعم) کے عم زاد تھے اور حضرت محد (صلعم) کے داماد بھی۔ کیونکہ حضرت علیؑ نے جناب رسالت ماب (صلعم) کی دختر (حضرت) فاطمہؑ سے شادی کی تھی۔ لیکن یہ تحقیق میں نے بعد کے برسوں میں کی۔ ان کا خواب میں مجھ پر ظاہر ہونا ایک خاص ملاقات اور تسکین بخش ورود تھا۔

ہندوستان میں مذہب ہمیشہ سے ایک حساس معاملہ رہا ہے۔ یہ شعلہ مزاج بھی ہے جس سے اکثر بودے بہانوں پر فسادات بھڑک اٹھے۔ لہٰذا سوناماتی کی ہدایت سے قطعاً" ہٹ کر بھی' میں پہلے پہل کسی سے اپنے خواب پر گفتگو کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ بعد میں جب میں نے مذہب پرست مسلمانوں اور درگاہوں پر اس کا ماجراہ بیان کرنا شروع کیا تو وہ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے اور اسے محض میرا ذہنی واہمہ گردان کر رد کر دینے پر مائل ہو جاتے "تم مسلمان نہیں ہو" بعض نے کہا "چنانچہ وہ (حضرت علیؑ) تمہارے پاس کیوں کر آئیں گے؟"

"مجھ سے نہ پوچھو کیوں؟" میں نے کئی ایک مشہور اور بلند مرتبت مسلمانوں یا عربوں کو اکثر جواب دیا "حضرت علیؑ سے پوچھو"۔

واقعہ خواب اس دوران پیش آیا تھا جب میں نظام سابع' حیدر آباد کے متعلق اپنی کتاب "ناقابل یقین مغل" لکھنے میں مشغول تھا جبکہ وہ زندہ تھا اس سے ملنا دشوار کام تھا۔ اس سے انٹرویو لینا امر محال سمجھا جاتا تھا۔ محض اس وجہ سے کہ میں اس کے دست راست اور مشیر مالیات' تارا پورے والا کو جانتا تھا کہ عالی مرتبت نے مجھے شرف باریابی بخشنے پر آمادگی ظاہر کی۔

ہماری ملاقات کی سہ پہر کو' جب مجھے ملا ہوا نصف گھنٹے کا وقت ختم ہوا تو میں رخصت ہونے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ نظام کا اگلا ملاقاتی سر الیگزینڈر کلٹر بک ہندوستان میں برٹش ہائی کمشنر تھا' جو اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن نظام نے فیصلہ کیا کہ میں بھی مزید ٹھہروں اور ان کے ساتھ چائے پیوں۔ یہ **حضرت علیؑ کی کرامات تھی۔ نظام عالی نہاد علیؑ کا نذر کیا ہوا مرید تھا۔ اگرچہ نظام کا خاندان شاہی سنی العقیدہ تھا' یہ عجیب اتفاقات کا نتیجہ تھا کہ نظام سابع اپنے والد کے تخت کا حقدار قرار پایا جو عاجزانہ طور پر شاہی محل سے باہر ایک مغنیہ کے ہاں پیدا ہوا جو اس کی ماں تھی۔ لیکن یہ مغنیہ حضرت علیؑ کی اس قدر غیر معمولی پرستار تھی کہ اس کا بیٹا ہندوستان کی عظیم ترین' شاہی شہزادے کے شایان شان ریاست کا حکمران بننے کیلئے پیدا ہوا۔**

یہ اس طرح ممکن ہوا کہ جب لارڈ کرزن بطور وائسرائے ہند' سرکاری دورے پر حیدر آباد آیا' یہ لڑکا محل کی عمارت میں اکیلا مرد وارث موجود تھا۔ اسے پیش کیا گیا اور لارڈ کرزن نے منظوری دیدی کہ وہ اپنے والد نظام ششم کا جانشین ہو گا۔ ایک دفعہ وائسرائے کے ساتھ معاہدہ طے پا جانے کے بعد کہ نوخیز عثمان علیؑ ہی نظام سابع ہو گا۔ سرکاری مہر تصدیق ہمیشہ کیلئے اس کے نام پر ثبت ہو گئی۔ اگرچہ نظام ششم کے ہاں اس کی ایک زیادہ مرتبے والی بیوی کے ہاں دو بیٹے بعد میں پیدا ہوئے۔ ایک مغنیہ کا بیٹا' حضرت علیؑ کی بخشش سے' اپنے باپ کے بعد حیدر آباد کے اعلیٰ تخت پر بیٹھا۔

میں چائے پر رک گیا۔ مشیر مالیات جس کے ہاں اس اختتام ہفتہ کو میں حیدر آباد میں مہمان خانہ تھا نے اپنی بیگم سے اظہار رائے کیا "بہت غیر معمولی بات ہوئی ہے" وہ نظام اور میرے بارے میں حوالہ دے رہا تھا--- "یہ ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس (یعنی نظام) کا عمومی برتاؤ کا طریقہ نہیں ہے۔ انہوں نے اس طرح ملاقات جاری رکھی جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں"۔

مجھے پورا اندازہ ہو گیا کہ ہمارے درمیان یہ ملاقات کس نے کروائی تھی۔ میں نے حضرت

علیؑ کے حکم پر "ناقابل یقین مغل" (Fabulous Mogul) کتاب لکھی' اگرچہ اب مرحوم نظام اس حقیقت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کتاب کے ذریعے میں نے سابقہ عظیم شاہانہ ریاست کی کھوئی ہوئی شہرت کو بحال کر دیا جس میں نہرو نے اپنی مسلح افواج بھیجی تھیں' جس کو "پولیس ایکشن" کا نام دیا گیا۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ نظام کو اس وقت اس کے مشیروں نے صحیح راستہ نہیں دکھایا تھا۔ ہندوستان یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے زیرِ ناف ایک خود مختار شاہانہ ریاست قائم رہے۔

حیدر آباد (دکن) میں ایک پہاڑی **"مولا علیؑ"** کہلاتی ہے۔ میں نے ذہن نشین کر لیا تھا کہ اس کا تعلق یقیناً اسی "جواں مرد" سے ہو گا جو مجھے خواب میں نظر آئے تھے۔ نظام (دکن) کے فرزند ثانی' پرنس معظم جاہ نے مجھے اپنی دودھیا رنگ کی پیکارڈ کار دی اور اپنا ایک مصاحب' ہنری لش وز نامی ایک کرسچن لڑکا مجھے اس پہاڑی پر لے جانے کیلئے میرے ہمراہ کر دیا۔

معظم جاہ تاش کے کھیل کا میرا ایک دیرینہ ساتھی تھا۔ 1938ء میں جب میں انگلینڈ سے واپس آیا--- 1947ء' سال آزادی' اس نے بمبئی کی مالابار ہل پر واقعہ حیدر آباد اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں کئی ناقابل یقین ضیافتیں دی تھیں۔

لیکن جب مجھے کئی برس بعد شہزادے سے حیدر آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ کافی حد تک سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ عابد بن گیا تھا۔ وہ اپنے مکان کی بالکونی میں میرے ساتھ کھڑا ہوا' ایک خاص سمت کو سر نیہوڑائے چپکے چپکے دعا پڑھ رہا تھا' جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ مولا علیؑ نامی پہاڑی کس طرف ہے؟

"میں ابھی اسی کی جانب دعا پڑھ رہا تھا" اس نے جواب دیا۔

اس اتفاقی اظہار خیالات کے مطابق ہی میں اس روز' اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مولا علیؑ نامی پہاڑی کی طرف عازم سفر ہوا۔ تین بجے سہ پہر' لشوز اور میں نواح شہر میں سے سفر کرتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں پہنچے جہاں مجھے پتہ چلا کہ ہمیں پہاڑی کی چوٹی پر واقعہ چھوٹی خانقاہ تک رسائی پانے کیلئے چار سو پچانوے سیڑھیاں چڑھنی پڑیں گی۔ ہم آہستہ خرامی سے اس ڈھلوان پہاڑی پر' راستے میں کئی مرتبہ سانس لینے کیلئے رکنے کے بعد چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ معمر نظام راستے میں بغیر ایک مرتبہ رکے پہاڑی پر چڑھنے کے عادی تھے جو ان جیسے سال خوردہ آدمی کیلئے غیر معمولی بات تھی۔ لیکن لشوز اور میں ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ چوٹی پر پہنچے۔

پھر ہمارے چہرے اتر گئے کیونکہ اس مقدس مقام کے دروازے پر ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا

جس پر لکھا تھا: "غیر مسلموں کے لئے اس جگہ سے آگے بڑھنا منع ہے"۔

یہ بات اس سہ پہر' دکن کی گرم سطح مرتفع پر جس میں حیدر آباد واقع ہے نہایت مایوس کن تھی کہ ایک اینگلو انڈین جو ہنری تھا اور ایک پارسی جو میں بذات خود تھا مولا علیؑ نامی پہاڑی کی چار سو پچانوے سیڑھیاں اس لئے چڑھے تھے کہ محض یہ پابندی پڑھ سکیں کہ ہم ایک قدم آگے اس لئے نہیں بڑھ سکتے تھے کہ ہم مسلمان نہیں تھے۔ نہ ہی وہاں کوئی نظر آ رہا تھا جس کے ساتھ ہم دلیل بازی کر سکتے۔

اچانک اس مقدس یادگار کے اندر سے کچھ ہلچل سی سنائی دی۔ ہمیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مسلمانوں کی ہر مقدس درگاہ میں ایک محافظ موجود رہتا ہے جو مجاور کہلاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ لہٰذا مولا علیؑ میں بھی ایسا ہی تھا۔ مجاور گہری نیند سویا ہوا تھا جیسا کہ اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا' اس بڑے بورڈ کے قریب آ کر کھڑا ہوا جو ہماری رسائی میں حائل ہوا تھا اور مجھے اندر آنے کیلئے اشارہ کیا۔ میں جھجکا اور اس بورڈ کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ میں مسلمان نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر کو اس انداز میں خم کیا جیسے مجھے بتانا چاہتا ہو کہ "مجھے معلوم ہے' مجھے پتہ ہے"____ لیکن وہ مجھے اندر آنے کیلئے دعوت دینے میں اٹل تھا۔

ہنری لشوز کے بارے میں کیا ہو جو میرے پہلو میں کھڑا تھا؟ وہ بھی اندر آسکتا تھا جیسا کہ مجاور کی مرضی سے ظاہر تھا۔ تاہم ابھی تک اس نے ہم میں سے کسی ایک سے ایک لفظ نہیں بولا تھا کیونکہ وہ ابھی تک نیم خوابیدہ حالت میں تھا۔ چنانچہ ہم اندر داخل ہوئے' خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے' کیونکہ ہمیں ابھی اپنے آپ پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہم ایک چھوٹی' سو مربع فٹ چوگوشہ میں داخل ہوئے جس کا فرش پتھریلا تھا' جو چار دیواری میں گھرا ہوا تھا' لیکن زیر آسماں کھلا ہوا تھا جس کے آخر میں ایک ستون بنا ہوا تھا جو پھولوں کے ہاروں سے آراستہ تھا جو جھلسانے والی گرمی سے مرجھا گئے تھے۔ مجاور نے ستون تک ہماری رہنمائی کی اور اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ گویا یہ اظہار کرنا چاہتا تھا کہ ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔

"اس ستون کی موجودگی کا کیا مطلب ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔ "مولا علیؑ یہاں عبادت کیلئے تشریف لائے" مجاور نے جواب دیا "اس ستون کے پیچھے ایک پتھر پر ان کی ہتھیلی کا نقش موجود ہے۔ یہاں آؤ' میں تمہیں اس کو دکھاتا ہوں" اس نے مجھے ستون اور اس دیوار کے درمیان تنگ جگہ کے راستے اپنے پیچھے آنے کو کہا جس میں وہ پتھر ابھرا ہوا' مگر نظروں سے پوشیدہ نصب تھا۔ میں نے ویسا ہی کیا میں

اندر کی طرف بڑھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے پتھر پر رکھ دیا۔ یہ ایک تختی تھی جو سیدھی لگی ہوئی تھی اور میں اس میں ایک مردانہ ہاتھ کی بناوٹ چھو کر معلوم کر سکتا تھا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ اس پر آسودہ ہوا' میں نے اچانک دلی یقین کے ساتھ' ایک دھڑکن محسوس کی اور میرے ہاتھ میں' جونہی وہ پتھر میں پچکی ہوئی جگہ پر لمس پذیر ہوا ایک پرزور یقینی پھڑکتی رو دوڑ گئی۔ میرا داہنا ہاتھ جو حضرت علیؑ نے خواب میں تھاما تھا' اب ان کے دست مبارک سے مس ہو رہا تھا۔ حضرت علیؑ سے اپنی نزدیکی اس عجیب انداز سے پہلے پہل ذہن نشین ہوئی۔

میرے بعد' ہنری کو بھی پتھر میں وہ پچکی ہوئی جگہ اس طرح دکھائی گئی۔ جب وہ باہر آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے کیا محسوس کیا "پتھر کی سطح اونچی نیچی ہے" اس نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں کسی اور حس کا اندازہ ہوا؟ میں نے پھر پوچھا۔ ہنری نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تاہم میرے ہاتھ میں صریحاً" ایک دھڑکتی تھرتھری پیدا ہوئی تھی۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ یہ چڑھائی چڑھنے کی وجہ سے نہ ہوئی ہو۔ لیکن اگر دھڑکن اسی بات کا نتیجہ تھی تو اسے ربط مس ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جانا چاہئے تھا۔

حضرت علیؑ نے کس ٹھیک جگہ عبادت گزاری تھی یا کس پہاڑی سے یہ پتھر لایا گیا تھا' میں نے دریافت نہیں کیا۔ لیکن جونہی میں نے دیوار کی ایک درز سے' نیچے پھیلی ہوئی سطح مرتفع پر' اپنی کیفیت قلب کو سالہا سال پہلے کی طرف منعطف کرتے ہوئے نظر ڈالی میں انہیں مرغزاروں میں سے آتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ ایک دہکتی ہوئی روشنی ان کی پیش روی کرتی ہوئی' ان کے راستے کو روشن کرتی ہوئی جیسے جیسے وہ چلتے جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ محض میرا تخیل کام کر رہا تھا لیکن چونکہ میں انہیں خوب وضاحت کے ساتھ خواب میں دیکھ چکا تھا' لہٰذا وہ اس قدر زندہ لگ رہے تھے' اس قدر میری آشنا شخصیت' کہ اگر وہ ساتھ پھر کبھی چل رہے ہوتے تو میں انہیں باسانی پہچان لیتا۔

تب میں اس ستون کی طرف گھوم گیا جو اس سنگی تختی کو چھپائے ہوئے تھا اور میں اپنی بندگی بجا لایا اور اظہار ممنونیت کیا اس دستگیری پر جو انہوں نے نظام پر کتاب لکھنے میں فرمائی تھی۔ "آپ نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا میں اسے اسی انداز میں لکھ رہا ہوں جس میں لکھا جانا آپ کو پسند خاطر ہو گا۔ بقیہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں"۔... مجاور ابھی تک' نیم

غنودگی کی حالت میں، میرے پاس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے پپوٹے کھل اور بند ہو رہے تھے۔

"جب ہم آئے تو کیا تم سو رہے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"گہری نیند" اس نے جواب دیا "یہ وقت عموماً" میرے آرام کا ہوتا ہے"۔

"مجھے افسوس ہے" میں نے کہا "کہ ہم نے تمہیں جگا دیا"۔

"تم نے نہیں" مجاور نے اطمینان سے جواب دیا "مولا علیؑ نے جگایا تھا"۔

"انہوں نے تمہیں بیدار فرمایا تھا؟" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

"ہاں" مجاور نے کہا "وہ اکثر مجھ سے کلام کرتے ہیں"۔

"انہوں نے کیا فرمایا تھا؟"

"انہوں نے حکم دیا "اٹھو دروازے پر جاؤ"۔

میں کامل احترام سے سنتا رہا۔

"انہیں اندر داخل ہونے دو" اس نے مزید بتایا "جب میں دروازے پر آیا اور دیکھا کہ آپ مسلمان نہیں تھے تو انہوں نے پھر حکم دیا۔ 'انہیں اندر آنے دو'۔۔۔ اس لیے میں نے آپ کو اندر آنے کیلئے کہا"۔

"وہ تم سے کیسے کلام کرتے ہیں؟"

"میرے کان میں، مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے" مجاور نے وضاحت کی۔

"اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہم مجاوروں میں جو دن اور رات کسی درگاہ میں خدمت بجا لاتے ہیں۔۔۔ اور ہر درگاہ سے مخصوص معصوم روح میں ایک واسطہ قائم ہے۔ کامل روحیں اپنی منشا ہم پر آشکارا کرتی ہیں، ہم صرف ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ہمارا تعمیل کرنے کے علاوہ کوئی اختیار نہیں ہے" "اگر انہوں نے تمہیں ایسا حکم نہ دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟"

"کچھ نہیں" اس نے اختصار سے جواب دیا "میں یونہی سوتا رہتا"۔ اس نے بتایا کہ جب ہم چلے جائیں گے تو وہ بعینہٖ یہی کرے گا۔ میں نے ہنری سے کہا کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ اور اس کے ذرا دیر بعد ہم سیڑھیاں اترنا شروع کر چکے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اب مغرب کی طرف سے چلنے والی ہلکی بادِ نسیم سے خفیف سی خنکی ہو چلی تھی۔

سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے مکرر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں اظہار ممنونیت ادا کیا کہ انہوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس روز ایک نئی ہمہ جہت سرفرازی پا لینے کے بعد، تارا پوریوالہ کے گھر کی طرف واپس چل پڑا۔

اس کے جلد ہی بعد مجھے یہ آگاہی ہونے لگی کہ حضرت علیؑ میری زندگی کے معمولات میں دستگیری فرمایا چاہتے تھے۔ جس کا راستہ واضح طور پر تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ اگرچہ کسی معیار سے شیریں، پر آسائش زندگی نہیں تھی، بعض اوقات تو یہ اس سے بھی بعید تھی۔ یہ زندگی ان کی ذات میں میرے اعتقاد کیلئے اکثر آزمائش اور پرکھ بن گئی تھی۔ ایک ایسا عقیدہ جس کو تقویت دینے کیلئے عموماً" کوئی جواز یا منطق پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض پوشیدہ عقیدت ہی ہوتی ہے جیسا کہ سادہ لوح لوگ اس مقدس روح کی طاقت عمل اور فیض رسانی میں رکھتے ہیں جو خدا کے زیر دامن ہے اور جس نے اپنے عقیدت مند مرد و زن کیلئے اپنی عبادت گزاری سے انسانی اذیت میں اس قدر بہتری پیدا کی تھی۔ تمام سرنوشتیں، اس کی پرزور پراتھناؤں سے قالب پذیر ہوتی بھائی پڑتی تھیں۔ یہ اسی کی مناجات ہی ہے جو بے حد زود اثر ہے اگر یہ کسی کی خاطر پڑھی جائے۔ تاہم اس نے بارہا ان مردوں کو سختی سے منع کیا ہے وہ اس کی بے بصیرت تقلید کرتے ہیں کہ اسے مقتدر اعلیٰ ہستی ماننا کفر ہو گا۔ لیکن خدائے برتر سے شدید قربت صریحاً" عیاں ہے اور حضرت علیؑ کی ماننا بنیادی سچائی کی طرف اٹھا ہوا پہلا قدم ہے، جس کی پیروی کرنا تمام دیندارانہ زندگی کی علت نمائی ہے۔

کرنٹ کے سارے معاملات صحیح طور پر نہیں چل رہے تھے۔ وہ اخبار جسے شروع کرنے میں حضرت علیؑ نے میری مدد فرمائی تھی۔ میرا کمپنی کے پہلے چیئرمین سے اس پالیسی پر اختلاف رائے ہو چلا تھا جو میرے نئے ہفت روزہ کی اشاعت کیلئے بنائی گئی تھی۔ وہ ایک قانونی مشیر تھا۔ ہم سکول کے دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن پھر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہماری دوبارہ ملاقات اتفاقیہ تھی کیونکہ وہ واقعتاً" ہائی کورٹ میں کام کر رہا تھا جبکہ میرا ایک مقدمہ وہاں لڑا جا رہا تھا۔ بعد ازیں اس نے نئی کمپنی بنانے میں میری امداد کرنے کی پیش کش کی اور اس میں اپنا روپیہ لگایا۔

لیکن اب ایک مشکل دور آگیا تھا، جس میں ہم 'کرنٹ' کے معاملات میں ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ بات میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ میں پہلے ہی حکومت سے مقدمہ بازی کر رہا تھا۔ کثیر مالی دباؤ سے بچ نکلنے کیلئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اخبار کو انتظامی تجربہ کاری کی کمی کی وجہ سے متعدد دھچکے لگ چکے تھے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بڑھتی ہوئی کشاکش کی وجہ سے زندگی میرے لئے دوبھر ہو گئی۔

اس جانفشانی کے دور میں، میں ایک مرتبہ اس قدر دلگیر ہو گیا کہ میں نے بابا (حضرت علیؑ) سے کہا "آپ کی جو خوشی ہو کیجئے۔ آپ نے مجھے یہ اخبار نکالنے پر آمادہ کیا۔ یہ آپ کا

اخبار ہے۔ آپ ہی فیصلہ کریں۔ میں اس قدر دلبرداشتہ تھا کہ پرچے یا میرے ساتھ جو بھی کمتر ہو مجھے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں تھی۔

کچھ عرصہ گزر گیا اور یہ زچ کرنے کی صورت قائم رہی۔ تب ایک پیر کو بعد دوپہر ہمارے چیئرمین کنس میں آئے' میرے خیال میں معمول سے کچھ زیادہ شادمان' جیسا کہ وہ کئی ہفتوں سے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے چیکوں پر دستخط کرنے کا کام نپٹایا' ہمارے اکاؤنٹنٹ کے ساتھ گفتگو کی اور پھر میری میز کی طرف آئے۔ ہم ایک ہی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔

"سرخ روشنی جلا دیجئے" انہوں نے کہا "میں آپ سے نجی گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔

ایک ریس کی کتاب' جو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی' میری میز پر اپنے سامنے رکھ لی۔ بمبئے سے 120 میل جنوب مشرق میں واقع پونا میں گھڑ دوڑ ہو رہی تھی۔ یہ موسم برسات کے دوران کی بات ہے۔ میں نے اپنی سرخ روشنی جلا دی جس سے دروازہ ازخود بند ہو گیا اور میں ان کے بولنے کا منتظر ہو گیا۔

"میں آپ کو یہ بتانے کیلئے آیا تھا کہ میں 'کرنٹ' میں اپنی شراکت مزید برقرار نہیں رکھنا چاہتا"۔ انہوں نے بتایا۔

میں مارے حیرت کے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی "دو نہایت خاص باتیں حال ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہیں اور میں نے 'کرنٹ' کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ میرے حصص کیلئے کسی معقول قیمت پر کوئی خریدار تلاش کر دیجئے اور میں اپنے آپ کو علیحدہ کر لوں گا" اس نے ایک دوستانہ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔

ہم نے مصافحہ کیا' پھر میں کسی حد تک تسکین پا کر' اپنی کرسی میں پیچھے کی طرف ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دریافت کیا "کیا بات ہوئی ہے؟"

"میں تمہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط پر کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا جائے گا۔

میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

انہوں نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً" یوں تھا "کچھ روز پیشتر مجھے ایک انوکھا خواب دکھائی دیا۔ میں نے ایک سن رسیدہ خاتون کو دیکھا جو سفید ساڑھی میں ملبوس تھی اور جس کے بال بہت لمبے تھے۔ اس کے پیچھے تین باریش مرد کھڑے تھے جو لمبی سفید قبائیں پہنے ہوئے تھے۔ اس خاتون نے مجھے میرا نام لیکر مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا "کیا تم مجھے نہیں جانتے؟" جب میں نے اسے جواب دیا کہ میں اسے نہیں جانتا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کی والدہ تھی"۔

اپنی ماں کا ذکر آتے ہی میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی کے اندر کپکپی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ اس حوالے سے میں جانتا تھا کہ وہ تین سفید عبائیں اوڑھنے والے مرد کون تھے۔ لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں اسی طرح سنتا رہا۔

"پھر تمہاری ماں نے کہا 'تم کس لیے میرے بیٹے کو ہراساں کر رہے ہو؟' "جب میں نے احتجاجاً" کہا کہ میں ایسا نہیں کر رہا تو وہ ناراض معلوم ہوئی اور پھر کہنے لگی۔ 'اسے تنہا چھوڑ دو'"

میں اس کی داستان سنتے ہوئے بے چینی محسوس کرنے لگا۔ میں نے ہلکا سا اضطراری قہقہہ لگایا تاکہ اپنی بے کلی جھٹک سکوں۔ پھر اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تم سے میں جھگڑ سکتا ہوں' لیکن یہ!" اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں--- اور بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی--- گزشتہ روز میں گھڑ دوڑ کے مقابلوں کے بعد پونا سے بذریعہ ہوائی جہاز واپس آ رہا تھا۔ تمام مسافر جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور جونہی ہم نے اپنی حفاظتی پٹیاں باندھیں جہاز کی تمام بتیاں گل ہو گئیں۔ تاریکی میں ایک آواز مجھ سے مخاطب ہوتی سنائی دی جو ہندی میں بات کر رہی تھی"___ ہمارے چیئرمین نے اپنی گھڑ دوڑ کی کتاب اٹھا لی' اس کے اندر کا ایک صفحہ الٹا جہاں سے اس نے وہ الفاظ پڑھے جو اس نے سننے کے بعد نوٹ کر لیے تھے۔

آواز نے فرمایا "وقت آ گیا ہے کہ جب تمہارا 'کرنٹ' میں رہنا تمہارے یا اخبار کیلئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ للذا میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم دوستانہ انداز میں علیحدہ ہو جاؤ۔ تمہیں اپنے حصص کی جو بھی قیمت ملے اس کے لئے قطعاً" فکرمند نہ ہونا۔ تمہیں اپنے حصص کی جو رقم ملے گی میں تمہیں اس سے گیارہ گنا زیادہ دلوانے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرے بیٹے! تمہیں 'مشکل آسان' کی نصیحت ہے" جونہی اس نے اپنی بات ختم کی' جہاز کی روشنیاں دوبارہ دکنے لگیں"۔

میں نے یہ طرفہ سرگزشت کامل سناٹے میں آ کر سنی۔ میں مبہوت رہ گیا۔ میں واقعی مبہوت رہ گیا۔ پہلے ماں اور لمبی سفید قباؤں میں ملبوس وہ تین بزرگ--- اب ایک آواز جس نے نام بھی بتلایا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ جانتے ہیں یہ کون شخصیت تھی جن کی آواز آپ نے سنی تھی؟" اس نے پھر اپنی ریس کی کتاب سے حوالہ دیکھا اور کہا "انہوں نے کہا تھا کہ وہ مشکل...." "ہاں" میں نے اسے ٹوکا "مگر کیا آپ جانتے ہیں وہ کون ہیں؟"

اس نے جواب دیا کہ "نہیں"۔

"وہ حضرت علیؑ تھے' وہ شخصیت جو ایک مرتبہ مجھے خواب میں دکھائی دی تھی" "ہو سکتا ہے" اس نے کہا' لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اسے یہ احساس ہو سکا ہو کہ یہ ماجرا میرے لئے کس

قدر اہمیت رکھتا تھا۔

چند روز بعد ہی ایک شخص اور اس کی اہلیہ جو ہمارے اچھے دوست تھے' ہمارے گھر میں وارد ہوئے۔ کسی صورت اس نے یہ موضوع چھیڑ دیا کہ 'کرنٹ' کیسی ترقی کر رہا تھا اور میری کمپنی کے چیئر مین کے بارے میں' جس کے متعلق اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا اس سے نزاع تھا۔۔۔ پھر اچانک ہی' اس نے پوچھا "اس کی اخبار میں کتنی پتی داری ہے؟"

"اکتیس ہزار روپے" میں نے اسے جواب دیا کیونکہ مجھے اپنی کمپنی کے ہر حصے دار کی سرمایہ کاری کے اعداد و شمار معلوم تھے۔

"اسے بتا دیں کہ اگر وہ اپنے حصص بیچنا چاہتا ہو تو میں انہیں گیارہ ہزار روپے میں خرید لوں گا"۔

دوسرے روز میں نے آفس جا کر اپنے چیئر مین کو اس پیشکش کی اطلاع دی اور اسے فوراً منظور کر لیا گیا۔ یہ حصص اس کے فوراً بعد منتقل کر دیئے گئے۔

مجھے اپنی کمپنی کا چیئر مین بننا پڑا کیونکہ کوئی دوسرا اس عہدے کی ذمہ داری قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوا۔ لیکن میں نے بہ لحاظ اہمیت اپنے لئے ایڈیٹر کے عہدے کو ہمیشہ قابل عزت سمجھا۔

جب اس باب کو تحریر کرنے تک نوبت پہنچ گئی تو میں نے اپنے سابقہ چیئر مین سے دریافت کیا کہ آیا وہ لمبی مدت گزر جانے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس واقعہ کا ذکر کرنے کی اجازت دیں گے تو انہوں نے بے تامل مجھ سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں پابندی اٹھا رہا ہوں"۔

سونامائی نے ایک مرتبہ مجھ سے اشارتاً" کہا تھا کہ اگر میں اپنی کتابوں میں سے کوئی ایک اس کی موت کے بعد اس کے نام منسوب کروں تو اسے بہت مسرت ہو گی۔

"مائی' آپ کی موت کے بعد ہی کیوں؟" میں نے پوچھا "آپ کے جیتے جی کیوں نہیں؟"

"نہیں بیٹے' ابھی نہیں" اس نے زندہ دلی سے احتجاجاً" کہا "لیکن میری موت کے بعد یہ بات مجھے بہت مطمئن کرے گی۔"

"ناقابل یقین مغل' آپ کے نام منسوب ہو گی" میں نے اس کے احتجاج کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ انتساب اس طرح تھا۔

___"سونا ایرانی کے نام جنہوں نے رہنمائی کی"___

ڈیرک ورسول جس نے میری اولین کتاب "نہرو، کشمیر کا عیش پرست" چھاپی تھی۔ وہی ناقابل یقین مغل، چھاپ رہا تھا اور مجھے یوم اشاعت پر لندن میں پہنچنا تھا۔ اشاعت کے دوران ہی ورشول نے اچانک اپنا کاروبار اندرے ڈی۔ یوش کے ہاتھ بیچ دیا اور کئی بار تاریخ تبدیل کئے جانے کے بعد، ڈی یوش نے مجھے نئی تاریخ اشاعت کی اطلاع دی۔ میں، حسب فیصلہ، دو بار تاریخ اشاعت تبدیل ہونے کے باوجود لندن پرواز کر گیا۔

کتاب کی رونمائی سے ایک رات قبل، میں تھیٹر دیکھ کر رات گئے، کرزن سٹریٹ میں واقع اپنے کاروباری کمرے میں لوٹا۔ جونہی میں بیرونی دروازہ کھول رہا تھا ایک تاکیدی بحری تار میرے سپرد کیا گیا جسے تار کا پیغام رساں لڑکا حوالے کر گیا تھا۔ یہ میرے نام تھا اور ہندوستان سے آیا تھا۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ مائی مر چکی تھی۔ وہ ایک مختصر علالت کے بعد وفات پا گئی تھی۔ ان لوگوں نے جو وقت مرگ اس کے پاس تھے، مجھے بعد میں بتایا کہ اس نے اپنی موت سے پہلے یقیناً کسی کو دیکھا تھا، کیونکہ اس نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا، اپنا سر اٹھایا، اپنے بستر پر ذرا سا جھکی اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے--- "ہاں، میں حاضر ہوں!"___ پھر اس نے اپنا سر پیچھے ڈال دیا، اپنے تکیے پر گری اور اس کی جان پرسکون انداز میں اس سے جدا ہو گئی۔

مائی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ جب بھی چاہے گی اس دنیا سے جا سکے گی۔ کیا حضرت علیؑ اسے ساتھ لے جانے کیلئے آئے تھے؟ یا کاکوری کے وہ ولی آئے تھے جنہوں نے اسے حضرت علیؑ سے رابطہ پیدا کرنے کی استعداد عطا کی تھی۔ یہ ہم کبھی نہیں جان پائیں گے۔

دوسرے روز لندن میں میری کتاب پہلی بار منظر عام پر آئی جو مائی کے نام منسوب کی گئی تھی لیکن یہ حیران کن بات تھی کہ انتسابی کتبہ، اس کی خواہش کے عین مطابق، اس کی موت کے بعد شائع ہوا نہ کہ اس کی زندگی میں جیسا کہ میرا اشتیاق تھا۔

یہ جولائی 1955ء کی بات ہے۔

حاشیہ

۱- یہ لفظ مخصوص ہے ایسے زبردست آدمی سے جو طاقت کا مظہر ہو اور اس سے قوت ضوفگن ہوتی ہو۔ لیکن جو محض پٹھوں کی نمائش کرنے والا نہ ہو۔ پہلوان ایک اصطلاح ہے، عزت کے معنوں میں۔ چونکہ یہ اس طاقت کو استعمال کرتے ہیں جو تقویٰ اور راست شعاری پر دلالت کرتی ہے (مصنف)

پانچواں باب

نجف میں

اس کی ابتداء 1968ء میں گردے میں پتھری سے ہوئی۔ ایکسرے سے ظاہر ہوا کہ پتھری کبوتر کے انڈے کے برابر اور اسی وضع کی تھی۔ آپریشن ناگزیر ہو گیا۔ اس کیلئے 8 جولائی کا دن مقرر ہو گیا۔ مجھے کئی عوارض لاحق تھے مثلاً مجھے ذیابیطس بھی تھا۔ ڈاکٹروں نے مختلف لیبارٹری ٹیسٹوں کی فہرست تیار کی اور میری اس تنبیہہ کی کہ مجھے 'انسولین' سے الرجی کا عارضہ لاحق ہو سکتا تھا--- پرواہ نہ کی۔ انہوں نے کہا "فکر نہ کریں۔ ہم آپ کی الرجی کی حساسیت کم کر دیں گے"۔

7 جولائی کو' دوپہر کے کھانے سے کچھ دیر پہلے' میری بیوی اور میں نے طے کیا کہ ہمیں نرسنگ ہوم میں جانے سے پہلے' شہر کے دوسرے کونے میں جا کر طمی سے ملاقات کرنی چاہئے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ طمی سے ملے ہوئے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ میں آپریشن کیلئے جانے سے پہلے سونامائی کی اصل جائے عبادت پر دعائیں مانگنا چاہتا تھا۔

جونہی میں کمرہ عبادت سے باہر آیا میری بیوی نے کہا کہ وہ بھی اندر جانے کی متمنی تھی۔ چنانچہ وہ گئی--- بعدہ ہم نے طمی کو الوداع کہی اور اپنے حلقہ شہر میں واقع نرسنگ ہوم واپس پہنچ گئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میری بیوی پیچھے ایک کونے میں۔ جیسا کہ میں نے اندازہ کیا کہ وہ میرے آپریشن کے متعلق فکر مند ہو گی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "گھبراؤ نہیں.... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

"میں فکر مند نہیں" اس نے جواب دیا "میں جانتی ہوں کہ سب صحیح ہو گا" اس کے پراعتماد لہجے پر مجھے تعجب ہوا کیونکہ قبل ازیں جو چھوٹی باتیں اس نے کی یا کہی تھیں ان سے وہ میرے بارے میں انتہائی بے چین معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس قدر اطمینان قلبی کے ساتھ کس طرح یہ بات کہہ سکتی تھی؟ اس کے جواب میں اس نے سکون سے کہا۔

"بابا نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ایسی بات کہی تھی' میں نے اس سے معلوم کیا "انہوں نے تمہیں یہ کب بتایا؟"

وہ آگے جھک گئی۔ "جب میں ممی کے ہاں کمرہ عبادت میں تھی--- اور میں یہ دعا کر رہی تھی 'بابا' وہ آپریشن کیلئے جا رہے ہیں۔ ازراہ کرم انہیں مجھے زندہ سلامت واپس کرنا---

پھر میں نے کچھ اگربتیاں روشن کیں اور کچھ دعائیہ کلمات کہے۔ میری آنکھیں یقیناً بند تھیں جب میرے کانوں میں یہ آواز سنائی دی 'تمہیں اس استدعا کی ضرورت نہیں' وہ اس (آپریشن) سے بخیر وخوبی گزر جائے گا'--- الفاظ قطعاً" واضح تھے اور میرے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا---"

"کیا اس سے پہلے بھی تمہارے ساتھ ایسا واقعہ ہوا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "کبھی نہیں" میری بیوی نے جواب دیا "لہٰذا میں اب قطعی فکرمند نہیں ہوں"۔

اگرچہ جو کچھ میری بیوی نے بیان کیا مجھے اس پر یقین تھا۔ یہ آزمودہ کاری جسے اس نے اس سکون کے ساتھ سنایا تھا میرے لئے انتہائی انوکھی تھی۔ ہم نرسنگ ہوم پہنچ گئے اور مجھے میرے لئے مخصوص شدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اب تقریباً دوپہر ہو چکی تھی۔ جلد ہی ایک خوش وضع' اینگلو انڈین نرس دھیمے سے اندر آئی۔

اس نے مجھے 'انسولین' کے پانچ قطروں کا انجکشن دیا اور باہر چلی گئی-- میری بیوی میرے بستر کے نزدیک بیٹھ گئی--- یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا انجکشن کوئی ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ دس منٹوں کے بعد نرس پھر اندر آئی اور دریافت کیا "آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟" میں نے انکار میں جواب دیا۔ اس نے اس مرتبہ دس قطرے انسولین' میرے جسم میں داخل کی اور پھر باہر چلی گئی۔

جب مزید دس منٹ گزر گئے تو نرس پھر ایک مرتبہ آئی تاکہ مجھے بقیہ انجکشن لگا دے۔ یہ کہتے ہوئے "اب آپ دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ کون کہتا ہے کہ آپ 'انسولین' سے الرجک ہیں؟" اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک وارڈ بوائے ٹرے میں میرا کھانا لے آیا اور میں نے کھانے کے چند ہی نوالے کھائے تھے کہ 'انسولین' سے پیدا شدہ الرجی واضح طور پر عیاں ہونا شروع ہو گئی۔ میرے ہونٹ اور چہرہ سوجنا شروع ہو گئے۔ میری بیوی نے نرس کو بلانے کیلئے گھنٹی بجائی---

"یہ ہیں آپ اور یہ ہے آپ کی حساسیت کم کرنے کی سعی جو پوری تیزی کے ساتھ ابھر رہی ہے" میں نے کہا۔

نرس کی ساری دلجمعی کافور ہو گئی اور اس نے بعجلت انتظام کیا۔ منٹوں میں میڈیکل افسر

اور وارڈ کی سینئر نرس میرے پاس موجود تھے۔ انہوں نے ورم دور کرنے کیلئے مجھے فوراً ایک انجکشن دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرے ڈاکٹر بھی آ گئے۔ سرجن' معالج اور کچھ عملے کے ارکان۔

"ہم کل آپ کا آپریشن کیسے کر سکتے ہیں؟" ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔

"دوستو میں بتا چکا ہوں کہ میں ایک عجوبہ ہوں لیکن آپ نے میری بات پر کان نہیں دھرا" اس کے بعد انہوں نے میرے کہنے پر کچھ توجہ دینی شروع کی۔ اسی روز' بعد دوپہر بے ہوشی کی دوا دینے والا ڈاکٹر آیا۔ اس نے بہر تعارف کہا "جب میں میڈیکل کالج میں تھا تو میں نے آپ کی کئی کتابیں پڑھی تھیں۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ سے واقف ہوں۔ اب آپ مجھے اپنے متعلق بتائیے"۔ "ڈاکٹر" میں نے جواب دیا "میں ایسا شخص ہوں جو یورش کو ناپسند کرتا ہے۔ بچپن سے ہی کسی دباؤ کی مدافعت کرنے کیلئے میرے اندر خود ساختہ قوت موجود ہے۔ اگر آپ مجھے سوڈیم پینٹیتھال' یا کوئی بھی بے ہوشی کی دوا جو آپ تجویز کریں مجھے آہستگی کے ساتھ دیں اور میرا نظام اسے قبول کر لے گا اور اسی طرح عمل کرے گا جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ میرے ساتھ ہڑبڑی کریں گے اور مجھے بہت جلدی بے ہوش کریں گے تو میں نادانستہ طور پر مدافعت کروں گا۔ یہ بات یاد رکھیں"۔

اس کے بعد میرے خون میں شوگر کا پھر معائنہ کیا گیا۔ گولیوں اور غذا میں سختی سے پرہیز سے اس پر قابو پا لیا گیا۔ اور ایک کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ میرا آپریشن مقررہ وقت پر یعنی اگلی صبح ہو گا۔ میرا سرجن اسی رات گئے پھر ایک مرتبہ مجھے دیکھنے کیلئے آیا۔ اس نے کہا "عام طور پر میں پینتالیس منٹ میں گردے کی پتھری نکال دیتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے لئے اس سے دگنا وقت صرف کروں"۔

دوسری صبح آئی اور جیسے ہی مجھے آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری کی جا رہی تھی 'پیتھی دائن' کے زیر اثر' بے حد غنودگی کے عالم میں میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا اور کہا۔۔۔

"میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ میں کچھ زیادہ ہی باعث تکلیف ثابت ہوں گا۔ لیکن فکرمند نہ ہونا۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے اس بات کا یقین ہے" پھر میں بے ہوشی کی نیند سو گیا اور مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ آپریشن میں چار گھنٹے صرف ہوئے۔

کچھ روز بعد' میں نے اپنے ڈاکٹروں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں تاکہ میں اس ماحول میں زیادہ سکون محسوس کروں جس سے میں مانوس تھا۔ میرا بارہ انچ لمبا زخم نہیں بھر رہا تھا اور دوسرے آپریشن کی بات بھی چل نکلی تھی۔ تاہم گیارہویں دن وہ شدید درد جو مجھے مسلسل ہو رہا تھا اچانک کم ہو گیا۔ پتھری کا وہ ذرہ جس نے نالی کا راستہ

روک رکھا تھا' باہر نکل گیا اور کھلا زخم مندمل ہونا شروع ہوا۔ اسی شام جب رات کی ڈیوٹی والی نرس آئی' وہ میرے بستر کے قریب دو زانو بیٹھ گئی۔ پٹی کھولنے سے پہلے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا "گیارہ دنوں کے بعد' یہ چند گھنٹوں میں مندمل ہو گیا ہے--- یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"...

اس سال کے اوائل ہی سے' مجھے حضرت علیؑ کے روضے کی زیارت کرنے کی آرزو پیدا ہو گئی تھی' جس کے متعلق مجھے علم تھا کہ وہ عراق مین' بغداد کے نزدیک ہی' نجف میں واقع ہے۔ آپریشن کے بعد' جیسے ہی میں اچھا ہوا' نجف جانے کی لگن بہت زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ "بابا' مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دیجئے"___ میں شب در شب اپنی دعاؤں میں ان سے استدعا کرتا رہا۔ ان کی طرف سے' بہرحال' کوئی اشارہ یا پیغام نہیں ملا۔

جس سڑک پر ہمارا ٹھکانہ تھا' اسی پر ایران کے قونصل جنرل عباس نجم اور ان کی اہلیہ کی بھی رہائش گاہ تھی--- ہماری ان سے اچھی جان پہچان تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھے فون پر' فیملی سمیت اپنے گھر شام کی دعوت پر مدعو کیا تاکہ میں ان کے سفیر متعینہ دہلی سے ملاقات کروں--- چونکہ میں پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا تھا اس لئے ہم نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوران گفتگو ایرانی سفیر نے ضمناً" کہا کہ ان کے ملک کا' جو میرے آباؤ اجداد کی سرزمین تھی' سفر میری صحت یابی کا ایک بہترین ذریعہ ہو گا "میں آپ کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیتا ہوں"۔ انہوں نے کہا۔

میں نے جواب دیا "میں اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں کیونکہ میں قریب ہی عراق میں جا کر نجف کی زیارت کرنے کا بے حد مشتاق ہوں"۔

"یہ تو پڑوس کی بات ہے" سفیر نے زور دیتے ہوئے کہا "امثال امر کے طور پر ایران میں حضرت علیؑ کے لاکھوں مخلص معتقدین ہیں"۔

اس طرح ایران اور عراق کے مشترکہ سفر کا خیال پیدا ہوا۔ میں اس اختتام ہفتہ میں اس تجویز پر غور کرتا رہا اور پیر کو میں نے عراق کے قونصل جنرل کو ٹیلی فون کر کے اس سے ملاقات کا وقت لیا۔ مجھے کافی پر بلا لیا گیا--- اس کے ملک میں کچھ اندرونی سیاسی خلفشار تھا اور مجھے یہ علم نہیں تھا کہ تمام عراقی سفارت خانوں کو خفیہ ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ کسی صحافی کو عراق میں داخلے کیلئے ویزا نہ دیا جائے۔ قونصل جنرل مجھے اس پابندی کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے سفر عراق کی غرض معلوم کی۔ میں بھولپن سے اٹھا' اپنی شرٹ اتاری اور اسے اپنے زخم کا دائرہ نما لمبا نشان دکھا کر کہا--- "آپ یہ دیکھ رہے ہیں۔ اسے حضرت علیؑ نے اچھا کیا۔ میں نجف جا کر ان کی خدمت میں شکرانہ ادا کرنا چاہتا ہوں"۔

"حضرت علیؑ" قونصل نے پوچھا۔ وہ حیران تھا کہ میں جناب کا نام بھی جانتا تھا۔

"ہاں حضرت علیؑ!" میں نے دہرایا "وہ آج سے چودہ برس پہلے خواب میں دکھائی دیئے تھے"
"لیکن تم مسلمان نہیں ہو۔ حضرت علیؑ تمہارے پاس کیوں آنے لگے؟"
"مجھ سے اس کی وجہ نہ پوچھیئے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

قونصل جنرل، جس کا نام حماد تھا، نے کہا کہ وہ بغداد میں خط لکھ کر میرے لئے اجازت طلب کرے گا۔ لیکن جیسا کہ اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ اسے بغداد سے جاری شدہ ہدایات کی وجہ سے امید نہیں تھی کیونکہ ان میں صحافیوں کیلئے ویزا قطعاً" بند کیا گیا تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ حماد عراقی حکومت کو لکھے گا۔۔۔ میں نے ایرانی قونصل خانے سے دریافت کرنا شروع کیا کہ میرے دوراہ ایران کیلئے انہیں کون سی تاریخیں موزوں رہیں گی۔ کئی دفعہ کی گفتگو، تاروں کے تبادلے اور سفارتی واسطوں کے ذریعے پیغام رسانی کے بعد، پلان طے پایا کہ مجھے پہلے تہران جانا چاہئے پھر بغداد کیلئے ہوائی سفر کرنا چاہئے۔ ٹاک کی سیدھ، تہران دونوں شہروں میں سے نزدیک تر تھا۔

یہ طے ہونے کے بعد میں نے عراقی قونصل خانے کو ٹیلی فون کر کے جلد ہی ویزا دینے پر زور دیا۔ حماد نے ایک عجیب قول سے میری بات کا جواب دیا "اگر حضرت علیؑ آپ کو وہاں بلانا چاہتے ہیں تو میری حکومت بھی آپ کو نہیں روک سکتی" اس نے کہا کہ وہ میرا پاسپورٹ لینے کے لئے میرے دفتر آرہا ہے۔ حماد کے اس نادر قول اور اس کے میرے ہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بغداد کو لکھے بغیر اسے اچانک ایک پیغام بذریعہ تار ملا تھا جس میں صحافیوں پر لگائی گئی پہلی پابندی کے احکامات کو منسوخ کیا گیا تھا۔۔۔ "اس طرح مجھے پتہ چلا کہ حضرت علیؑ آپ کو بلانا چاہتے تھے" حماد نے بتایا۔ "اور ہمیں جن کا علیؑ پر ایمان ہے۔۔۔ ان کے معزز مہمان کی عزت کرنا واجب ہے"۔

معزز مہمان! اس اصطلاح سے منسوب کیا جانا بھلا لگا۔ حماد نے مشورہ دیا کہ میں پہلے بغداد کی طرف ہوائی سفر اختیار کروں کیونکہ ہر سنیچر کی صبح کو نہایت مناسب وقت پر بی۔ او۔ اے۔ سی کی بمبئی۔۔۔ بغداد سیدھی پرواز مل سکتی تھی۔ نجف کے بعد میں تہران مراجعت کر سکتا تھا۔ چونکہ یہ تجویز پروازوں کے جدول کے نقطہ نظر سے بے حد موزوں تھی، میں نے ایرانیوں سے دریافت کیا کہ آیا میں اپنے تہران کے سفر کی تاریخوں میں ردوبدل کر سکتا تھا۔ وہ نہایت درجہ متفق تھے۔ لہٰذا میں نے بی۔ او۔ اے۔ سی سے بغداد کیلئے سیٹ بک کروا لی۔

نجم، ایرانی نے اپنے فارسی کیلنڈر پر مختلف تاریخوں کا حساب کرتے ہوئے ضمناً" کہا "یہ حیران کن بات ہے لیکن آپ کے پروگرام میں ان تمام تاریخوں کے اس قدر ردوبدل کے بعد

آپ بغداد میں سنیچر کے روز پہنچیں گے اور دوسرے روز یعنی اتوار کو میرے کیلنڈر کے لحاظ سے حضرت علی علیہ السلام کا روز ولادت ہے۔ یہ ایک خوشگوار اتفاقی مطابقت ہے۔ آپ اس بڑے بابرکت دن وہاں ہوں گے۔"

مجھے احساس ہوا کہ یہ اتفاق سے کچھ فزوں تر تھا۔ یہ اطلاع پا کر میں نے ایرانی قونصل خانے سے واپسی پر اپنی بیوی کو بتایا کہ میں سنیچر وار کو یقینی طور پر عازم سفر تھا۔ میں نے فخریہ طور پر اعلان کیا "حضرت علیؑ اتوار کو' اپنے روز ولادت پر وہاں میری حاضری چاہتے ہیں"۔

راستے میں ایک جگہ رکنے کے بعد' میں بغداد کے ہوائی اڈے پر 10 بجے صبح اترا۔ بی۔ او۔ اے۔ سی نے اپنی بغداد کی برانچ کو میری آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ ان کے انگریز منیجر نے ہوائی اڈے پر آکر میرا استقبال کیا۔

"میں چند لمحوں کی اجازت لوں گا" منیجر نے کہا "اور پھر میں آپ کو شہر لے جاؤں گا"۔

"آپ بخوشی جا سکتے ہیں" میں نے جواب دیا "مجھے کوئی عجلت نہیں ہے"۔

میں طیران گاہ میں ایک کاؤنٹر کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا جبکہ وہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ جب میں گھوم پھر رہا تھا تو میں نے ایک عرب نوجوان کو' جو ہلکے بھورے سوٹ میں ملبوس تھا' ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا جو گلے سے نکلنے والی بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"کھورا کھا... کھورا کھا...." اس آواز سے ایسا اندازہ ہوتا تھا گویا وہ کھجوریں یا سپاری یا کوئی اور چیز پھیری پھر کر بیچ رہا ہو۔

وہ عربوں کے مختلف جمگھٹوں کے پاس رک کر' ان سے بات کرتے ہوئے دو مرتبہ میرے گردا گرد گھوما۔ اس دوران بی۔ او۔ اے۔ سی کا منیجر میرے پاس آ چکا تھا اور عرب نوجوان اپنے تیسرے چکر پر تھا۔ وہ ابھی تک بلند آواز میں پکارے جا رہا تھا---

"کھورا کھا--- کھورا کھا---"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ اتفاقاً" وہ مجھے تلاش کر رہا ہو؟" میں نے انگریز منیجر سے دریافت کیا۔

"بمبئی سے؟" اعرابی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" بی۔ او۔ اے۔ سی کے منیجر نے میری طرف سے جواب دیا۔

"اید--- یتر" اعرابی نے معلوم کیا--- تب میں سمجھ گیا کہ وہ میرا نام لے رہا تھا--- اید--- یتر' اس کا اپنا انداز بیان تھا-- "ایڈیٹر" کیلئے--- ایسا لفظ جسے میں بی۔ او۔ اے۔ سی

کے اونچے عہدیدار سے بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ میں نے اعرابی کو بتایا کہ اس نے وہ آدمی پا لیا تھا جس کی وہ تلاش میں تھا۔

"کھوراکھا" اس نے پھر پوچھا تاکہ وہ یقین کر لے کہ اسے صحیح آدمی مل گیا تھا۔

"ہاں' اسی سے ملتی جلتی کوئی چیز" میں نے جواب دیا کیونکہ میں اس صبح کو ایک مطمئن کسی قدر سنجیدہ موڈ میں تھا۔ بلند قامت اعرابی نے اپنی اندرونی جیب سے کاغذ کا ایک چھوٹا ٹکڑا نکالا اور سیدھا کھڑا ہو کر' اس پر ٹائپ شدہ الفاظ' لے کے ساتھ پڑھنے لگا۔

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ ہماری حکومت کے مہمان ہوں گے" اس نے یہ تحریری نغمہ' اس قدر سنجیدگی سے پڑھا کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ گویا مجھ پر فرد جرم عائد کی جا رہی تھی اور مجھے گرفتار کیا جائے گا۔ ایک ایسا دستور جس سے میں اپنے دیس میں ناآشنا نہیں رہا تھا۔

"گورنمنٹ بی۔ او۔ اے۔ سی پر سبقت لے گئی ہے" بی۔ او۔ اے۔ سی کے خوش مزاج منیجر نے مجھے عراقی حکومت کی محافظت میں دیتے ہوئے کہا۔

وہ اعرابی مجھے ایک بڑی سفید شیورلٹ امپھالا میں سوار کرا کے شہر لے گیا۔ بغداد میں امریکن بند موٹر کار کوئی عجوبہ نہیں تھی۔ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک میں ایسی کاریں ویسی ہی عام ہیں جیسی کہ اس ملک میں جہاں یہ بنتی ہیں۔ شہر کی طرف دوران سفر ہماری شائستہ گفتگو ہوئی۔ میں نے بغداد کے بارے میں سوالات کئے اور اس نے جواباً" مجھ سے دریافت کیا کہ میں ہندوستان میں کہاں رہائش پذیر تھا۔ بمبئی میں کس طرح کی آب و ہوا تھی۔ تمام نہایت مہذبانہ بات چیت' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

جونہی ہم اس ہوٹل کی طرف جانے والی شاہراہ پر آئے جس میں میں نے اپنے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا کہ اس عرب نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ میرے دوران قیام میرا راہبر اور مترجم ہو گا۔

"اگر آپ کوئی سا عجائب گھر دیکھنے کے متمنی ہوں یا بعض لوگوں سے ملنے یا ان سے انٹرویو لینے کے خواہش مند ہوں تو میں اس کا بندوبست کر کے خوشی محسوس کروں گا"۔

میں نے اس کی نوازش پر شکریے کا اظہار کیا --- لیکن جواباً" کہا "میرے آنے کا واحد مقصد صرف ایک جگہ دیکھنا ہے اور وہ نجف ہے"۔

"نجف؟" اس نے حیرانی سے دریافت کیا "یہ جگہ یہاں سے قریب ہے تقریباً 180 کلومیٹر۔ لیکن آپ نجف جا کر کیا کریں گے؟"

"میں حضرت علیؑ کے روضے پر سیس نہواؤں گا" ___ میں نے جواب دیا۔

"آپ مسلمان تو نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"ایسا ہی ہے۔ میں نہیں ہوں"۔

"پھر آپ نجف کیوں جانا چاہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ایک روگ سے بچ نکلا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حضرت علیؑ نے میری جان بچائی تھی۔ میں یہاں ان کا شکرانہ ادا کرنے آیا ہوں"۔

"بہت بہتر، ہم کسی وقت جائیں گے" اس نے سرسری طور پر کہا "میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ لیکن اس کے علاوہ میں اور کیا پروگرام ترتیب دوں؟"

"بس اتنا ہی، نجف کی زیارت ہی میرا مقصد ہے"۔

عرب نوجوان سراسیمہ نظر آیا۔ جلد ہی ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ مجھے میرا کمرہ دکھایا گیا اور میرا محافظ میرے ہمراہ تھا۔ یہ قبل دوپہر کا وقت تھا۔ عرب نوجوان نے کافی پینے کیلئے رائے پوچھی۔ میں نے اس پر صاد کیا۔ عربوں کیلئے کافی آداب رسوم میں داخل ہے۔ ہلکی مٹھاس والی، سیاہ ترکی کافی جس کا اپنا جھاگ اس کے اوپر تیر رہا ہو۔ ہم نے بے تکلف گفتگو شروع کر دی۔ پھر وہ گویا ہوا۔

"جناب آپ مجھے اس سوال پر درگزر فرمائیں گے کہ جب آپ مسلمان نہیں ہیں تو آپ نجف جانے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں؟ پھر اس نے جھٹ سے اضافہ کیا "میرے اس ذاتی سوال پر معاف فرمائیں گے"۔

"کوئی بات نہیں میں نے جواب دیا "میں آپ سے اس کی وضاحت کروں گا۔ چودہ برس قبل میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اس سپنے میں حضرت علیؑ مجھ پر ظاہر ہوئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔ انہوں نے اپنے چہرہ مبارک سے نقاب ہٹا کر مجھے زیارت کروائی: انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے دست مبارک میں لیا۔ تب سے میں انہیں راہنما مان رہا ہوں۔ اس سال کی ابتدا سے ہی مجھے شدید لگن تھی کہ میں ان کے روضے پر حاضری دوں۔ لہٰذا میں یہاں آ پہنچا ہوں"۔

"لیکن میری سرکار کے نزدیک آپ ایک نامور صحافی ہیں"۔

"یہ تو ایک سفر زیارت ہے"۔

میرا طویل قامت عرب معاون پہلے سے زیادہ محو حیرت دکھائی دیتا تھا۔ پھر یقیناً ازخود وہ کہنے لگا "اگر آپ کی سیاحت کا مقصد نجف جانا ہے۔ ہمیں پہلے یہی کرنا چاہیے۔ آئیے چلیں"۔

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"فی الفور' دوپہر کے کھانے کے بعد"۔

میں نے اس کی رائے پر لمحہ بھر غور کیا۔ میں اس صبح کو جلدی بیدار ہوا تھا تاکہ بروقت ہوائی سفر اختیار کر سکوں لیکن میں زیادہ کسلمند نہیں تھا۔ ایرانی قونصل کے کیلنڈر کے حساب سے حضرت علیؑ کا روز ولادت اتوار کو پڑ رہا تھا لیکن کیوں نہ آج ہی جایا جائے؟ میں نے اپنے آپ کو قائل کیا کہ 'میں کل پھر بھی جا سکتا تھا"۔

"ہاں ابھی" اس عربی نے مکرر کہا "ہمارے پاس کار ہے اور ہم ساڑھے تین گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔۔۔ سڑک اچھی ہے"۔

"بہتر' مناسب ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔ میں غسل کر کے کپڑے بدلوں گا"۔

"ہم دوپہر کے کھانے کے بعد فوراً چل دیں گے"۔ عربی نے بات طے کر کے کہا۔ وہ یہ کہتے ہوئے جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اپنے گھر جاؤں گا' اپنے گھر والوں کو اطلاع دینے اور گاڑی میں پٹرول بھروانے۔ جب تک آپ غسل کر لیں۔ میں آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا اور ہم دوپہر کا کھانا کھائیں گے"۔

میں نے ان انتظامات کے خودبخود ہو جانے پر مسرت محسوس کی۔ عربی چلا گیا۔ ایک بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ وہ واپس آ گیا اور ہم نیچے کمرہ طعام میں چلے گئے۔

کھانے کے دوران ہی' میرے عرب راہنما نے کہا "جب میں گھر گیا تو میں نے اپنی اہلیہ اور والدہ کو بتایا کہ آپ نے حضرت علیؑ کی خواب میں زیارت کی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ نجف جانے کے آرزو مند ہیں باوجودیکہ آپ مسلم نہیں ہیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا یہ مناسب ہو گا؟ تو میری والدہ نے جو کٹر مذہبی ہے جواب دیا اس کا حضرت علیؑ کے پاس جانے کیلئے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے"۔

جب دوپہر کا کھانا کھا لیا گیا تو ہم نجف کیلئے موٹر سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تندور جیسی تپش تھی۔ ہم 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تارکول کی طویل سیدھی سڑک پر اڑے جا رہے تھے جبکہ خشک لو ہمارے چہروں کو جھلسائے دے رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے میں سفر کے ابتدائی حصے میں سو گیا۔ لیکن نجف کے نزدیک میں بیدار ہو گیا اور اپنے راستے میں آنے والے چھوٹے دیہات میں بنے ہوئے مخصوص کچے عربی جھونپڑے دیکھنے لگا۔

ہماری کار کا ڈرائیور تذکرۃ الاولیاء میں ماہر تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میری منزل نجف تھی اور حضرت علیؑ سے مجھے خاص انسیت ہے تو اس نے وہ تمام داستانیں بیان کرنا شروع کر دیں جو نجف اور اس کے نواح میں واقع کربلا کے بارے میں وہ جانتا تھا۔ کربلا خشک میدانی علاقہ ہے

جہاں مقدس جنگ لڑی گئی اور جہاں (حضرت) امام حسینؑ، حضرت علیؑ کی پہلی زوجہ بی بی فاطمہؑ کے دوسرے بیٹے، اپنے دیگر اعزہ اور اصحاب کے ساتھ شہید کئے گئے تھے۔ وہ وہاں اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کی وفات کے بعد خلافت پر اپنے حق کو منوانے آئے تھے۔1 حضرت امام حسینؑ کے ساتھ حضرت عباسؑ بھی، امام حسینؑ کے بچوں کے لئے پانی لاتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ عباسؑ، حضرت علیؑ کی دوسری زوجہ ام البنین سے ان کے بیٹے تھے۔ لہٰذا عباسؑ حضرت حسینؑ و حسنؑ کے سوتیلے بھائی تھے۔ عباسؑ کربلا کے جہاد مقدس میں وفادار علمبردار تھے۔ انہیں علم دار کہا جاتا ہے۔ (حضرت) حسینؑ اور عباسؑ کربلا میں دفن ہوئے۔ خود حضرت علیؑ نجف میں مدفون ہیں۔ حضرت علیؑ کیلئے نجف کا بطور مدفن چناؤ حضرت محمد (علیہ الصلوۃ والسلام) کی خاص ہدایت پر عمل میں لایا گیا تھا"۔

تذکرۃالاولیاء، گھریلو قصے کہانیاں، مذہبی تاریخ، سب ایک جگہ جمع ہو گئیں جو ہمارے ٹیکسی ڈرائیور کے لبوں سے اس سیدھی سپاٹ طویل شاہراہ کے ساتھ ساتھ ادا ہوتی گئیں۔ اس سادگی کے ساتھ جیسی حکایتیں ہم نے بچپن کے دنوں میں سنی تھیں۔ ڈرائیور ہمیں بتانے لگا کہ کس طرح پیمبر حضرت محمدؐ کی وفات ہوئی۔ ڈرائیور کہنے لگا "حضرت محمدؐ بیمار یا علیل نہیں تھے۔ وہ عبادت خدا میں سیدھے کھڑے ہوئے تھے جب بہشت سے روح خداوند قدوس اتری۔2

"محمدؐ خدا نے حکم دیا، میرے ساتھ چلو، تمہارا کام دنیا میں ختم ہوا، (حضرت) محمدؐ نے اپنے خالق کو پہچانا اور انہوں نے عاجزی سے اپنے مادی وجود کو خدا کے حوالے کر دیا"۔

شاہراہ بغداد---- نجف پر ایک خاص مقام پر، ڈرائیور نے اپنا سر بائیں طرف پھیرا اور دور فاصلے پر ایک کھلی جگہ کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ پھر اس نے بیان کیا کہ کس طرح حضرت علیؑ کی شہادت ہوئی۔ "(حضرت) علیؑ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک قاتل نے ان پر زہر آلود تلوار سے وار کیا۔ حضرت علیؑ دو دن اور دو راتیں زندہ رہے۔ تیسرے دن وہ وفات پا گئے"۔

میں پورے انہماک کے ساتھ اس کی داستان سنتا رہا۔ ڈرائیور کہتا گیا "لوگ اس قدر مشتعل تھے کہ جب انہوں نے قاتل کو پکڑ لیا تو اس کا جوڑ جوڑ الگ کر دیا۔ انہوں نے اس کے بدن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے اور انہیں اس جگہ بکھیر دیا جہاں انہوں نے اس کو پکڑا تھا۔ جہاں جہاں وہ ٹکڑے گرے زمین سیاہ ہوتی گئی اور تب سے گھاس کا کوئی ایک تنکا یا پتہ بھی زمین کے اس ٹکڑے پر کبھی پیدا نہیں ہوا۔ آپ یہ سیاہ زمین ادھر فاصلے پر ملاحظہ کر سکتے ہیں"۔ وہ اس سمت مسلسل انگلی سے اشارہ کرتا رہا۔

اسلامی تاریخ میں، ہمارے ڈرائیور سے زیادہ ماہر ادیبوں کی لکھی ہوئی کتابیں اس سے

مختلف روایت بیان کرتی ہیں۔ ان سے علی علیہ السلام کی اپنے قاتل کیلئے فیاضی کا اظہار ہوتا ہے۔ کوفہ بھی، جہاں حضرت علیؑ کو شہید کیا گیا تھا، اس سمت میں نہیں ہو سکتا تھا جدھر ڈرائیور نے اشارہ کیا۔ نہ ہی ایسی تفاصیل میرے نجف کے پہلے سفر کے سلسلے میں اہم تھیں۔ ضروری بات یہ تھی کہ میں اس بندہ خدا کے حضور حاضر ہونے جا رہا تھا جو میرے پاس خواب میں آیا تھا۔

چنانچہ ہم نجف پہنچ گئے۔ ابھی ہم کچھ ہی میل دور تھے کہ مجھے بعد دوپہر کی دھوپ میں ایک سنہری قبے کا کلس رہ رہ کر چمکتا نظر آیا۔ چند منٹوں کے بعد، تنگ، پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے، ہم ایک دائرہ نما مارکیٹ کے نزدیک جا نکلے اور جب ہماری کار ایک بلند گزرگاہ کے ساتھ جا کر رکی جو روضے کی طرف جاتی تھی تو میں اس کے منظر کے جلال سے دم بخود رہ گیا کیونکہ وہ میری ہر توقع سے اس قدر مختلف تھا جس کے لئے میں چشم براہ تھا۔

نجف عرب کا ایک بہت چھوٹا سا مثالی شہر ہے۔ حضرت علیؑ کا مرقد اس قصبے کا مرکزی مقام ہے۔ ایک تنگ، بغیر فرش لگی، سڑک مقبرے کے گرد گھومتی ہے جس کے دونوں طرف دکانیں ہیں جن میں ہر قسم کا سودا بکتا ہے: کہربا کے دانوں کی تسبیحیں جو اعرابی استعمال کرتے ہیں۔ عبادت یا سجاوٹ میں کام آنے والے موٹے نمدے۔ حقے جن کے ذریعے کثیر مسلمان تمباکو نوشی کرتے ہیں اور کئی طرح کے زیبائشی پیتل کے برتن۔ تقریباً ہر تیسری دکان میں کھانے کی کوئی چیز بک رہی تھی جو مرچوں سے بھرے ہوئے، مصالحے دار شیش کباب، جن میں کا ہر کباب ایک فٹ لمبا تھا--- سے لیکر مٹھائیوں جن پر چاندی کے ورق اور مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں، تک مشتمل تھی--- اعرابی اپنی لمبی قباؤں میں ترکی کافی یا کولا کی ہی ایک قسم پی رہے تھے۔ دکانیں ڈھانچوں کی صورت میں اس طرح عارضی طور پر بنائی گئی تھیں جیسے کہ دیہاتی میلے کے موقع پر بنائی جاتی ہیں یہ تو بیرونی منظر تھا جسے ہم مشرق کے باسی دنیاوی اور بے کیف گردانتے ہیں۔

غروب آفتاب کے وقت، ہم نے کار سے نکل کر حضرت علیؑ کے مقبرے کے بیرونی پختہ صحن میں قدم رکھا۔ یہ ایک عظیم الشان قابل دید منظر تھا۔ مقبرے کے قبے کو نئے سرے سے چمکتے ہوئے طلائی پتر سے سجایا گیا تھا۔ غالباً" ان کے یوم ولادت کی خوشی میں۔ دو اونچے سنہری مینار اس متبرک مقام کے اطراف میں سنتریوں کی طرح ایستادہ تھے۔ سینکڑوں اعرابی کھلے صحن میں، دو زانو ہو کر، مشغول عبادت تھے۔ میں نماز مغرب کے وقت پہنچا تھا۔ عرب سماج میں نیا دن غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

اگرچہ اس منظر پر قبے کا چمکتا سنہری رنگ چھایا ہوا تھا اس مسجد کے بیرونی حصے پر، اعلیٰ

نمونے میں، ہلکے نیلے اور سفید غازہ ملے پچی کاری کے نقش و نگار آراستہ کئے گئے تھے جن میں سونے کے ملمع سے بوقلمونی کی گئی تھی اور حسب موقع مشرق وسطیٰ کے زنگار سے گلگونہ کیا گیا تھا۔ یہ رنگ عموماً" ایران و عراق کی مساجد میں نظر آتا ہے۔ عرب عورتیں یکساں طور پر سیاہ لباس پہنے میرے پاس سے گزر رہی تھیں جن کے چہرے پورے طور پر یا آدھے اپنی عباؤں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

روضے کی شاندار عمارت دنگ کر دینے والی تھی۔ اس نے آگرہ میں واقع تاج محل کے پھیکے جلوے کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سنگ مرمر کا مقبرہ جسے مغل شہنشاہ، شاہ جہاں نے اپنی ملکہ ممتاز محل کیلئے بنوایا تھا۔ نجف میں رنگوں کی چھوٹ کے بالمقابل تاج پھیکا لگتا۔

بیرونی صحن سے ہی میں اپنے اندر اضطراب کی لہر پہلے ہی دوڑتی محسوس کر رہا تھا۔ یہ گھبراہٹ کچھ اور بڑھ گئی جب میرے عرب ساتھی نے کہا "میرے پیچھے چلے آؤ۔ لیکن کوئی چیز نہ چھونا"۔

قبل ازیں اس نے مجھے کہا تھا کہ چونکہ میں غیر مسلم تھا اس لئے میں روضے کو باہر ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ بڑی مایوس کن بات تھی لیکن میں کسی متبرک مقام کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم مجھے یہ بات مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی کہ حضرت علیؑ نے مجھے اتنی دور سے ہندوستان سے آنے کی اجازت دی تھی۔ محض اس لئے کہ میں ان کے روضے کے بیرونی صحن میں ایک اچھوت کی طرح کھڑا ہو جاؤں۔ بہرحال، جس طرح مجھے بتایا گیا، میں نے عمل کیا۔ پھر کوئی بات ہو گئی جس نے میرے راہبر کی نیت کو بدل دیا۔ اس نے اندرونی مزار کے دروازے تک میری راہنمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں ہم نے جوتے اتار دیئے۔ کس چیز نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ مجھے خاص روضے کے اندر لے جا رہا تھا۔

لہذا میں معبد کے اندرونی حصے تک اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ جونہی میں بڑے کمرے میں پہنچا، تمام روشنیاں جل اٹھیں، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ گنبد ہزاروں چھوٹے آئینوں سے بھرا ہوا تھا جن میں لاکھوں روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ یہ ایک زرق برق نظارہ تھا۔ اس استقبال پر میں نے اپنے اندر تقریباً برقی رو دوڑتی محسوس کی۔

میرا جذبہ، جو میرے راہبر کی اس بات سے کہ کسی چیز کو چھونا نہیں پژمردہ ہو گیا تھا، پھر سے ابھر آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں وہاں پر حضرت علیؑ کے بذات خود، خاص بلاوے پر پہنچا تھا۔ میں نے پھر ویسی ہی بیقراری اور جوش آگیں تھرتھری محسوس کی جو میں نے اس وقت

محسوس کی تھی جب آپ چودہ سال پیشتر میرے پاس خواب میں تشریف لائے تھے۔ اپنا نسواری رنگ کا عربی لباس پہنے ہوئے جس پر ہلکا زردوزی کام کیا ہوا تھا۔ ان کی کمر میں بندی ہوئی سنہری ریشمی ڈوری پر ایک دستار بندھی ہوئی' کپڑے کا وہ ایک ٹکڑا جس نے ان کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا اور جسے انہوں نے میرے لئے بے نقاب کیا تھا....

دمکتی ہوئی روشنی کی وہ شعاع جو ان کے چلنے کے ساتھ ساتھ آگے آگے بڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ خواب میں نظر آنے والے لوگ جانتے تھے کہ وہ کون تھے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے' ان کے جلال اور احترام میں' ٹھنڈی سانس لیکر ان کا نام پکارا تھا۔ "حضرت علیؑ.. حضرت علیؑ"___ اب میں چودہ برس کے بعد' ان کے مزار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے مرقد کے عین اوپر بنا ہوا قبہ خالص سونے کا تھا اور اس کے گرداگرد استادانہ مہارت سے بنائی گئی چاندی کی نفیس' اونچی جافری تھی۔ اس مزار مقدس پر آنے والے زائر' اپنی دو انگلیوں سے چاندی کی منقش جالی کو پکڑ کر سر جھکائے ہوئے' دعائیں پڑھتے ہیں۔ چاندی کا یہ کٹہرا "دریچہ علیؑ" کہلاتا ہے۔ اسے 1940ء میں بمبئی سے مسلمانوں کے ایک فرقے داؤدی بوہروں کے مذہبی پیشوا نے بھیجا تھا۔ یہ کٹہرا چار لاکھ تولے چاندی اور دو ہزار تولے سونے کا بنا ہوا تھا۔ ایک تولہ چار اونس کے برابر ہوتا ہے۔ میں اس کے نزدیک نہیں گیا کیونکہ عربی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ کسی چیز کو چھونا نہیں۔ ایک مرتبہ جبکہ مجھے اس کی طرف دھکا لگا اور میرا ہاتھ اس پر جا لگا' میرے راہنما نے جلدی سے اسے کھینچ لیا۔

بڑے کمرے میں بے شمار لوگ تھے۔ کبھی کبھار ایک تنہا قلی' بید کے ہلکے تابوت میں کوئی میت سر پر اٹھائے ہوئے حضرت علیؑ کی تربت کے گرد ان کا نام لیکر' جلدی سے تین مرتبہ طواف کرتا۔ یہ دفن سے قبل کی رسم تھی۔

میں نے کمرے کے ایک کونے میں' ہندوستان سے اپنے ہمراہ لائے ہوئے بنڈل میں سے عود کی تین بتیاں جلائیں۔ انہیں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے' میں نے کھڑے ہو کر اپنے خاندان' اپنے کام کاج' اپنے دوستوں اور آخر میں اپنے لئے بھی دعا مانگی۔ سب سے بڑھ کر میں نے ان کا میرے پاس خواب میں تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا۔ اپنی ساری دعاؤں کے وقت میں کٹہرے سے دور رہا جیسا کہ مجھے کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تاہم میں اندرونی طور پر کچھ دلبرداشتہ ہوا کہ میں' جو اپنے آپ کو اس ولی سے' جو اس مقدس جگہ مدفون ہیں' اس قدر قریب سمجھا کرتا تھا۔ کٹہرے تک کو مس نہیں کر سکتا تھا جبکہ میرے خواب میں حضرت علیؑ نے اپنی رضامندی سے' میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

اسی لمحے ایک معمر پیشوا' جو ایک لمبی خاکستری عبا اور ایک سرخ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہمارے پیچھے آ رہا تھا میرے اور میرے عرب راہنما کے قریب آگیا۔ یہ پیشوا "سید" کہلاتے ہیں' اس جیسے کئی اور نجف کے اس بڑے کمرے میں موجود تھے۔ یہ شخص خاص کر بہت معزز لگ رہا تھا کیونکہ وہ بہت بزرگ تھا اور اس کی شخصیت حاکمیت کا انداز لئے ہوئے تھی۔ اس کی چھوٹی سفید ریش تھی' وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کا چہرہ فیض رساں تھا۔ اس نے میرے ہمراہی سے عربی زبان میں گفتگو شروع کی۔ میرا ساتھی قدرے گھبرایا نظر آیا۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "یہ سید آپ کے لئے دعا کرنا چاہتے ہیں"۔

میں نے اپنا سر نیہوڑایا تاکہ اپنی مرضی کا اظہار کر سکوں کہ مجھے خوشی ہو گی اگر وہ ایسا کرے۔ جونہی "سید" نے مجھے اپنی رائے پر آمادگی میں سر جھکاتے دیکھا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو اوپر کی طرف سیدھا کیا اور صاف بلند عربی میں' میرے لئے دعا پڑھنی شروع کی۔ یہ تقریباً تین منٹ جاری رہی۔ یہ ہمارے ارد گرد کی خاموشی میں گونجا کی۔ اگرچہ یہ عربی میں تھی۔ میں اس کے چند الفاظ ہی سمجھ سکا' میں دعا کے متن کو سمجھ سکتا تھا۔ اس (سید) نے میری صحت' میرے خاندان' میرے کاروبار کیلئے دعا کی۔ اس نے دعا کی کہ میرے دشمن مغلوب ہوں۔ اگرچہ یہ ایک مسلم درگاہ پر اور ایک ایسی زبان میں پڑھی گئی تھی جو میرے لئے غیر مانوس تھی مگر سننے میں دلپذیر تھی۔ پھر سید نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے سیدھا چاندی کی جافری تک لے گیا۔ وہاں اس نے ایک نوجوان سید کو اپنے ساتھ شامل ہونے کیلئے بلایا۔ اس نے نوجوان آدمی کو کچھ ہدایات دیں۔ دوسرے آدمی نے میرے لئے ایک اور دعا پڑھنی شروع کی۔ وہ چند الفاظ کہہ کر رک گیا اور میری طرف دیکھا۔ میرے عرب راہنما نے جلدی سے کہا "آپ کے اس کے الفاظ کو ضرور دہرائیں"____ عربی نہ جانتے ہوئے' میں نے اس کے الفاظ دہرائے جس پر دونوں سیدوں نے سر ہلا کر میری کوشش کو سراہا۔ اس طرح یہ دعا ہوتی گئی حتیٰ کہ پوری دعا تمام ہوئی۔ "انشاء اللہ"۔ ان دونوں نے آخر میں تقریباً یک زبان ہو کر کہا "اللہ سے ایک طرح کی نئی امید رکھنا کہ ہماری دعا قبول ہو گی"____ پھر سن رسیدہ سید نے میرا ہاتھ پکڑا اور میری دو انگلیاں چاندی کی منقش جافری پر رکھ دیں' وہی کام جو میرے ساتھی نے مجھے کرنے سے منع کیا تھا۔ سید نے مجھ سے عربی میں ایک جملہ کہا جس میں حضرت علیؑ کا نام تھا۔ اس نے میری طرف دو مرتبہ دیکھا اور دو ہی مرتبہ میرے راہبر سے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ شاید جس طرح حیدر آباد میں مقام مولا علیؑ کے مجاور کے ساتھ ہوا تھا۔ اس سید کو بھی (صاحب) مرقد کی طرف سے ہدایت ملی تھی کیونکہ اس نے ہمارے رخصت ہونے پر جس طرح مجھے جھک کر آداب کیا اس میں کچھ معنویت ضرور تھی۔

اس لمحے میرا دل لبریز تھا اور میرا ذہن کلی طور پر خالی تھا۔ وہ تمام باتیں جو میں حضرت علیؑ سے کہنے کیلئے آیا تھا' وہ ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔ میرا عربی راہنما ان سیدوں کی وجہ سے بے چین ہونے لگا تھا جو میرے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ اب ہمیں چل دینا چاہئے۔ میں نے بابا (حضرت علیؑ) کے سامنے تعظیماً" سر کو جھکایا اور ان کے مرقد پر ایک الوداعی نظر ڈال کر ہم صحن سے ہوتے ہوئے' بلند دروازے سے گزر کر' باہر بازار میں واپس چلے آئے۔

"اب ہم گھر چلیں" عربی نے کہا۔

"نہیں ہم گھر نہیں جائیں گے" میں نے شام کی اس خاکستری نیلگوں ساعت میں' اس دلکش درگاہ کی طرف نگاہ واپسیں ڈالتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ وہ مرقد جو حضرت علیؑ کا مزار تھا' میرا علیؑ جیسا کہ میں نے انہیں اس روز اور اس کے بعد ہمیشہ کہا ہے۔ شاید بے باکانہ لیکن اس دلبستگی کی علامت کے طور پر جو سالہا سال میں پروان چڑھی تھی۔

تب ہی عربی ہمراہی نے پوچھا "پیپسی کولا لیجئے گا؟"

یہ بات ظاہر تھی کہ ہم دونوں کی سوچ ایک جیسی نہج پر نہیں تھی۔ "نہیں" میں نے کہا "آپ کہیں ہو آئیں' آپ جائیں اور پیپسی کولا پئیں' کباب کھائیں' جو چاہیں کریں لیکن بیس منٹ کیلئے مجھے پریشان نہ کریں۔ میں خدا سے دعا مانگنا چاہتا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی میں مرقد کی طرف مڑا اور "سیدوں" کی طرح میں نے ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا لیں۔

"بابا" میں نے دعا شروع کی "آپ نے مجھے احمق بنایا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ایک فقیر کے روضے پر جا رہا ہوں لیکن کوئی شہنشاہ بھی آپ جیسا شاندار مقبرہ نہیں پا سکتا"۔

یہ نجف میں' اس شام کو غروب آفتاب کے ان لمحات میں کی بات ہے کہ میں نے عاجزی اختیار کرنی سیکھی' جس کے بغیر حضرت علیؑ سے قربت حاصل ہونا ممکن نہ ہوتی۔ یہ روح کی ایک حلیمی ہے' اس کا مفہوم بندگی یا چھیل اور رگڑ کرنا ہمواری دور کرنا یا ان طاقتوروں کے دستر خوانوں سے گرتے ہوئے روٹی کے ریزوں کا انتظار کرنا ہر گز نہیں ہے۔ تب سے یہ نزدیکی جو میں نے حضرت علیؑ کے لئے محسوس کی ہے ویسی ہی ہے جو ایک شیر خوار اپنے والدین کیلئے فطرتاً" محسوس کرتا ہے۔ جن کا وہ مرہون ہوتا ہے۔ میں نے انہیں "باوا" کہہ کر پکارنے کی ابتداء کی تھی جو گجراتی لفظ ہے' جسے میں نے بناوٹی محسوس کیا۔ نجف کے بعد' اسی عربی ماحول میں' جب میرا خواب

متشکل ہو گیا اور اس میں نظر آنے والے لوگ میرے لئے اب اجنبی نہ رہے تھے' میں نے انہیں "بابا" کہنا شروع کیا جو عربی میں باپ کیلئے بولا جاتا ہے۔ میں اب پہلے سے بڑھ کر ان کی مانتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں' چاہے اس کی کوئی توجیہ نہ کی جا سکے' کہ میں ان کے خاندان سے وابستہ ہوں۔ حیرت انگیز طور پر ایک خالصتاً" ذاتی نسبت جس میں تبدیلی مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میں اسی طرح پارسی ہوں جس طرح پیدا ہوا تھا۔

شام کا دھندلکا نجف پر چھا گیا اور میں نے اپنے عربی راہنما کو دیکھا کہ وہ لب سڑک بنے ہوئے ایک ریسٹورنٹ کے باہر ایک کرسی پر صبر سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اور اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ میں جانے کیلئے بالکل تیار تھا۔

لوگ روضے کے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ ایک "سید" باہر آیا۔ وہ داہنی آنکھ سے نابینا تھا۔ میں نے اپنے عربی ہمراہی سے کہا "اس سے پوچھو کہ حضرت علیؑ کا صحیح روز ولادت کب ہے؟"

جواب ملا "اب.... آج.... بالکل ابھی.... وہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا ہے"۔ میں اسی شب' نجف کے جوش سے معمور' بغداد واپس گیا۔ میں کوشاں تھا کہ میں ہر تفصیل کو جو میں یاد رکھ سکا' اپنے اندر سمو لوں اور اسے اس کے معانی سے مربوط کر سکوں۔ میں نے پورا اندازہ کر لیا کہ اگلے روز ایک اور دفعہ زیارت کیلئے نہیں جانا چاہئے۔ انہوں (حضرت علیؑ) نے پسند کیا کہ میں وہاں ایسے وقت پہنچوں جب ان کا روز ولادت شروع ہو اور میں حالات کے کئی خم و پیچ سے گزر کر' عین غروب آفتاب کے وقت پہنچ گیا تھا۔ دوسرے دن وہاں پھر سے جانا' اگرچہ وہ بھی ان کی پیدائش کا دن ہو گا' اپنی اس درخشاں پذیرائی کو' جو انہوں نے مجھ پر ارزاں فرمائی تھی' بے لطف کر دیتا تھا۔ میں اس رات بغیر کھانا کھائے سو گیا اور دوسری صبح میں نے معلوم کیا کہ آیا میں جس جہاز سے تہران جانے والا تھا' اس سے پہلے مجھے کوئی دوسرا جہاز مل سکتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ میں ایسا کر سکتا تھا۔ میں اتوار کی سہ پہر کو بغداد سے روانہ ہو گیا۔

ایران میں پانچ دن تیزی سے گزر گئے جن میں سے ایک دن اصفہان کے آراستہ پیراستہ ہوٹل شاہ عباس میں گزرا جو سیاحوں کیلئے عجوبہ چیز ہے۔ میں نے کچھ وقت وہاں کی شاہراہ پر واقع نوادرات کی دکانوں میں جھانکتے گزارا جہاں میں نے پرانے انگریزی چھ پنس کے سکے کے برابر قدیم زمانے کے چھوٹے طلائی تمغے دیکھے جن پر حضرت علیؑ کی شبیہ کندہ کی گئی تھی۔ وہ علیؑ جیسا

کہ ان کی شبیہ ایران میں اتاری جاتی ہے میرے ان کے تصور سے قطعاً" مختلف ہے جو میرے خواب پر بنی ہے۔ ایرانی شبیہ حضرت عیسیٰؑ سے ملتی ہوئی دبلی لمبوتری ہے۔۔۔ تاہم میرے ذہن میں جو تصویر واضح طور پر محفوظ ہے وہ ایک طاقتور اور شجاع مرد' ایک پہلوان کی ہے جیسا کہ میں پہلے ان کی تصویر کشی کر چکا ہوں۔

چھٹا باب



اختتامیہ

اس کے بعد ہر سال' میں نے علی علیہ السلام کی اپنے ساتھ کامل موجودگی کو مزید قریب محسوس کیا۔ میں نے فروری 1970ء میں نجف کی دوسری ہنگامی حاضری دی۔ اگرچہ انہوں نے مجھے اس کی اجازت دی' مگر وہ خوش نہیں معلوم ہوتے تھے کہ میں ان کے روضے پر اس وقت حاضر ہوا جب اس کے گنبد کی مرمت ہو رہی تھی۔

میں دوسروں کی اس توجیہ کو قبول نہیں کرتا کہ حضرت علیؑ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں' میں اپنی قوت فیصلہ پر زیادہ انحصار کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ بتدریج انس بڑھتا گیا ہے اور اکثر سخت مشکل' مایوس کن' بعض دفعہ خطرناک لمحات میں' میں نے انہیں پکارا ہے۔ درآنحالیکہ ان کی طرف سے مجھے کبھی کوئی 'آواز' سنائی نہیں دی' اکثر ایک خاموش علامت ہوتی ہے چاہے وہ صرف اگر بتی کے دھوئیں کے تیز چکروں کی صورت میں ہی ہو کہ انہوں نے میری پکار سن لی ہے اور یہ کہ وہ موجود ہیں۔

میرے انسٹھویں جنم دن سے پہلی رات کو میں بے حد شکستہ خاطر ہو کر سونے کیلئے گیا۔ میرا کوئی کام صحیح نہیں بن پا رہا تھا اور کشمکش کا دباؤ میری صحت پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ میں عبادت کی چوکی کے سامنے رک گیا۔ اگر بتی جلائی اور بولا "بابا! میں مانگتے ہوئے تھک گیا ہوں۔ آپ مجھے جو کچھ اور جب دینا چاہتے ہیں دیجئے۔ اب' میں سونے جا رہا ہوں"۔

میری سالگرہ کے دن (14 اپریل 1970ء کو) علی الصبح وہ ذرا دیر کیلئے میرے پاس خواب میں تشریف لائے۔ اس مرتبہ وہ فقیرانہ انداز کے سیاہی مائل خاکستری عربی چوغے میں ملبوس تھے۔ اس خواب میں' میں ایک پرانی فورڈ 1920ء ماڈل کی کار میں سوار ہو رہا تھا جس کی چھت پیچھے

سمٹی ہوئی تھی۔ اس میں ایک نوجوان عورت' نارنگی گلابی رنگ کا لمبی آستین والا جالی دار لباس زیب تن کئے' سر پر بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے بیٹھی تھی۔

"اب مت دیکھنا" میں اس لڑکی سے خواب میں کہتا ہوں "یہ شخص جو ہماری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ فقیر نہیں ہے وہ حضرت علیؑ ہیں"۔

جونہی میں نے وہ الفاظ ختم کئے کہ وہ کار کے دروازے والی طرف تک آ پہنچے' ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں گویا وہ پہچان لئے جانے پر شرما رہے تھے۔

صبح ہوتے ہی جب میں نے اپنی بیوی سے کہا "مجھے میرا سالگرہ کا تحفہ پہلے ہی مل چکا ہے" تو وہ جانتی تھی کہ وہ کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ کہنے لگی۔

"ایک اور خواب؟"

میں نے جواب دیا "ہاں' لیکن ایک مختصر سا۔ وہ خود نہیں آئے تھے کیونکہ وہ روشنی جو ان کے آگے چلتی تھی وہ اس میں نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے کسی اپنے جیسے کو بھیجا تھا مجھے یہ بتانے کیلئے کہ وہ ابھی ادھر ہی ہیں"۔

زیارت حضرت امیرالمومنین علیہ السلام

حضرت امام جعفر علیہ السلام سے روایت ہے کہ روضہ اقدس کی زیارت سے قبل زائر کو چاہئے کہ غسل کرے۔ پاک لباس پہنے اور اس کے بعد اپنے آپ کو معطر کر کے مزار پر حاضر ہو۔ عام زیارت وہی ہے جو الکلینیؒ نے اپنی کتاب کافی جلد دوئم، صفحہ نمبر 321 میں درج کی ہے اور وہ تقریباً ویسی ہی ہے جو کہ ابن بابویہ (علیہ الرحمۃ) نے اپنی کتاب من لایحضرہ الفقیہ، صفحہ نمبر 226 پر درج کی ہے اور جو اس طرح شروع ہوئی ہے۔

—— السلام علیک یا خلیل اللہ ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر اے اللہ کے پیارے دوست۔

—— السلام علیک یا حجۃ اللہ ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر اے وہ (جو کہ) ثبوت الٰہی ہے۔

—— السلام علیک یا خلیفۃ اللہ ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر جو اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔

—— السلام علیک یا عمود الدین اللہ ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر اے دین (کو اٹھانے والے) ستون۔

—— السلام علیک یا قسیم الجنۃ و النار ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر جو کہ جنت اور دوزخ کے تقسیم کنندہ ہیں۔

—— السلام علیک یا وارث النبین ○ و صاحب العصاء والمیسم ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر اے (کل) نبیوں کے (حقیقی) وارث) اور عصاء برادر اور صاحب ذوالفقار۔

السلام علیک یا امیر المومنین ○

(میرا) سلام ہو آپؑ پر اے صاحبان ایمان کے حاکم۔

اشھد انک کلمۃ التقویٰ و باب الھدیٰ و العروۃ الوثقیٰ و الحبل المتین و الصراط المستقیم ○

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ (بامعنی) کلمۂ تقویٰ ہیں اور (اللہ کی معرفت کے) دروازہ (علم و) ہدایت ہیں اور دین کی مضبوط و مستحکم رسی ہیں اور اللہ کا نہ ٹوٹنے والا عہد (وسیلہ اور سلسلہ رشد) ہیں۔

اشھد انک حجۃ اللہ علیٰ خلقہ و شاھدۃ علیٰ عبادہ امینہ علیٰ علمہ و خازن سرہ و موضع حکمتہ اخو رسولہ (ورحمتہ اللہ و برکاتہ ○

میں گواہی دیتا ہوں کہ (بیشک) آپؑ (ہی) خلق خدا پر اللہ کی حجت ہیں اور اس کے بندوں پر (اس کی طرف سے) گواہ ہیں اور اس کے علم (الدنی) کے (اس کی جانب سے) امانت دار ہیں اور اس کے خزانہائے (سراپا) اسرار کے خزینہ دار ہیں اور اس کی حکمت کی جائے قرار ہیں اور اس کے نبیؐ (آخر الزمان) کے بھائی ہیں (آپؑ پر اللہ پاک کی رحمتیں اور برکات ہوں (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔)

اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد ○